10

سموم و صبا

جوش ملیح آبادی

ناشر

منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لمیٹڈ

مفید عام پریس نکلسن روڈ دہلی

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز

قیمت برائے ہندو پاکستان ۸ روپے

8/-

آٹھ روپے

U11
ج 775 س
عنوان
J. & K. UNIVERSITY. LIB.
Acc No 48422
Date 19.3.64
CHECKED
ST 01
ALLAMA IQBAL LIBRARY
48422

2296

در بندِ آں مباش کہ مضموں نہ ماندہ است
صد سال می تواں سخن از زلفِ یار گفت

دُکھ شعر سے بے حساب پائے میں نے
ہر سانس میں سَو عذاب پائے میں نے
اُگلے جب بحرِ دِل نے سَو لعل و گہر،
تحسین کے کچھ حَباب پائے میں نے

اِبنِ آدم کو صاحبِ جاہ کرو،
کم بخت کو اب اور نہ گُم راہ کرو
"اللہ" سے انسان ہے کب کا آگاہ
انسان سے اِنسان کو آگاہ کرو

فہرست

نمبر	عنوان	صفحہ
۱	بَلند بینی	۱۵
۲	بِلکتی یادیں	۱۹
۳	فَریاد	۲۱
۴	کیا کروں	۲۳
۵	جَشنِ استِقلال	۲۶

نمبر	عنوان	صفحہ
۶	دعوتِ انقلاب	۳۳
۷	نگارانِ مُردہ	۳۵
۸	میرے بعد	۴۰
۹	نغمۂ سحری	۴۵
۱۰	یاد کرو	۴۸
۱۱	انجام	۵۱
۱۲	ہماری فرائض	۵۴
۱۳	وُہی رَفتار	۵۸
۱۴	اوہام وعقاید	۶۲
۱۵	قیدیوں کا حملہ	۶۴
۱۶	لاعلمی	۷۲

نمبر	عنوان	صفحہ
۱۷	دُہائی	۷۶
۱۸	رِم جھم	۸۱
۱۹	برستی ہوئی آنکھیں	۹۲
۲۰	درمانِ دردانگیز	۱۰۰
۲۱	کلکتہ	۱۰۷
۲۲	اعترافِ عجز	۱۱۹
۲۳	درسِ جرأت	۱۳۴
۲۴	رشوت	۱۴۱
۲۵	کب تک	۱۶۴
۲۶	تین فریادیں	۱۷۱
۲۷	کچوکا	۱۷۷

نمبر	عنوان	صفحہ
۲۸	صومعہ و میخانہ	۱۸۰
۲۹	جنگل میں منگل	۱۸۲
۳۰	کُتب خانہ	۱۹۵
۳۱	میں حیدری ہوں	۲۰۶
۳۲	مُشاعروں کو سلام	۲۱۴
۳۳	عقیدت کی موت	۲۲۲
۳۴	شُکرِ پروردگار	۲۳۰
۳۵	بے چارگی	۲۴۹
۳۶	اَلسَّلام	۲۵۴
۳۷	رُباعیاں	۲۷۹

سموم و صبا

جوش

بہ نامِ قوّت و حیات

بلند بینی

۱۹۴۸ء

کہاں تصوّرِ پستی بلند بینوں کو،
ہم آسمان سے لاتے نہیں زمینوں کو
اُسے تلاش ہو کیوں عرش کی خزینوں کی
لئے ہو گود میں جو فرش کے دفینوں کو
ہمیں ڈرائے گا کیا خاک بحرِ طوفاں خیز
کہ ہم نے سیل بنایا ہے خود سفینوں کو
نجوم و شمس و قمر دیکھتے ہیں حسرت سے
مِری کُلہ کے نہیں، کفش کے نگینوں کو

کسی کے در پہ جُھکاتے نہیں جو سر اپنا
اُنھیں یہ حق ہے چلیں تان کر وہ سینوں کو
مری نظر میں ہیں ناکارہ وہ سُبک فن کار
حسین تر جو بناتے نہیں حسینوں کو!
کدھر نگارِ روایت ہے؟ مسند آرا ہو
گرا چکا ہوں روایت کی شہ نشینوں کو
بہا دو خاک پہ یہ آبِ "نقل" ہم نفسو،
شرابِ عقل سے چھلکا دو ساتگینوں کو
لگاؤ، بڑھ کے عناصر کے مُنھ میں جلد لگام
کہ اِن کی پُشت پہ میں کس چکا ہوں زینوں کو

مرے دیارِ سخن کے دمیدہ ذرّوں نے
جُھکا دیا ہے مہ و مہر کی جبینوں کو
مری نزاکتِ دل نے جنھیں تراشا ہے
پہاڑ ٹوک کے دیکھیں اُن آبگینوں کو
قدیم کعبہ و کاشی کے حاجبو ہُشیار
مقامِ کُفر سے للکارتا ہوں دینوں کو
براہِ راست کجی تا کُھلے قدامت کی
جوان نسل میں بانٹا ہے خُوردبینوں کو
بشر کے ذہن پہ قرنوں سے جو مُسلّط ہیں
بدل رہا ہوں گُمانوں میں اُن یقینوں کو

میں اُن نواہیِ بے جا کا سر کچلتا ہوں
جو زندگی پہ چڑھاتے ہیں آستینوں کو
فضا پہ ٹیک دے چنگھاڑ مار کر گھٹنے
اِس آسمان پہ رکھ دوں جو اِن زمینوں کو
کل اُن کی نسل کا اے جوشؔ میں بنوں گا امام
خبر کرو مرے مسلک کے نکتہ چینوں کو

بلکتی یادیں

سرد مینا کا تصوّر، سرخ پیمانے کی یاد
عود کی خوش بو میں پھر آئی ہے مے خانے کی یاد

گوشۂ دل میں پچھاڑے کھا رہی ہے دیر سے
مست جھونکوں میں جنوں کے رقص فرمانے کی یاد

آئی ہے رہ رہ کے گرتی بجلیوں کے روپ میں
ایک شب پردہ اٹھا کر اُن کے در آنے کی یاد

لے رہا ہے ہچکیاں ایک ایک فرزانے کا نام
بھر رہی ہے سسکیاں ایک ایک دیوانے کی یاد

ولولوں کی فوج میں، بہکے ہوؤں کی موج میں،

سینہ زن ہے عنبریں زلفیں بکھر جانے کی یاد

دل میں آہیں بھر رہی ہے، بال بکھرائے ہوئے

لڑکھڑانے، گنگنانے، ناچنے، گانے کی یاد

داستانِ شیب بن کر آئی ہے روتی ہوئی

جس میں بوئے نوجوانی تھی، اُس افسانے کی یاد

مقبروں سے آ رہی ہے جھٹ پٹے کی چھاؤں میں

ایک ایک کر کے رفیقوں کے بچھڑ جانے کی یاد

جوشؔ ابرِ تیرہ میں گم ہے، مرا ماہِ منیر،

کشتہ شمعوں کے دھوئیں میں جیسے پروانے کی یاد

Jammu & Kashmir University Library.
Accession No.......

فریاد

۱۹۴۹ء

فریاد، ہو رہے ہیں اہلِ ہوس میں زائل
یہ عقل کے مباحث، یہ عشق کے مسائل

دیرینہ آرزو ہے اب تک شہیدِ حرماں
ہرچند پشت پر ہے اک لشکرِ وسائل

جس راہ میں، سنا تھا ہوتی ہے قدرِ جوہر
اُس راہ میں شک ہوں یا ایں ہمہ فضائل

ایماں اگر نہ لاؤں معراج پر تو کافر
گردن میں ہوں وہ بانہیں اک بار اگر حمائل

اک تو ہی مُجتنب ہے اے مہر و ماہِ گیتی

گو جُملہ دُختران گردوں ہیں مجھ پہ مائل

حیف ایک تو، نہ لکھے مکتوبِ شوق اُس کو

نازل ہوں برگِ گُل سے جس شخص پر رسائل

للّٰہ اک تجلّی، اک عشوہ، اک تبسّم

ای بادہ وش، صدف گوں، مہ رُو، سحر شمائل

کیونکر یقین کر لوں، خوں ریز و سنگ دل ہی

دلدارِ غنچہ طبع و یارِ صبا خصائل

دَرد اک جوش مجھ میں اور میری منزلت میں

خود میری زندگانی، میرا نفس ہے حائل۔

کیا کروں

۱۹۴۹ء

پھر دل میں دردِ سلسلہ جنباں ہے، کیا کروں
پھر اشکِ گرم و دعوتِ مژگاں ہے، کیا کروں

پھر چاک چاک سینہ ہے، آواز دوں کسے
پھر تار تار جیب و گریباں ہے، کیا کروں

پھر اتّصالِ گردن و خنجر ہے، کیا کہوں
پھر اختلاطِ زخم و نمک داں ہے، کیا کروں

پھر اک گرہ حریفِ نفس ہے، کسے بتاؤں
پھر اک کھٹک رفیقِ رگِ جاں ہے، کیا کروں

سینے میں ایک دشنہ سا لیتا ہے کروٹیں
رگ رگ میں ایک آگ سی غلطاں ہے کیا کروں

جس چیز پر مدار تھا درمانِ زیست کا،
وہ شے پھر آج درد کا عنواں ہے کیا کروں

پھر سر پر ابرِ دردِ جنوں ہے گھرا ہوا
پھر دل میں بوئے زُلفِ پریشاں ہے کیا کروں

پھر عشقِ ناصبور کا پرتو ہے روح پر،
پھر دل، حضورِ عقل، پشیماں ہے کیا کروں

راتوں کی نم ہواؤں میں، تاروں کی چھاؤں میں
بیتے دنوں کی یاد، پر افشاں ہے کیا کروں

جس چاندنی کو کھوئے ہوئے مدّتیں ہوئیں،
پھر ذہن کے اُفق سے نمایاں ہے کیا کروں
تقدیر نے کبھی جو نکالا تھا اک جلوس،
پھر جادۂ نفس پہ خراماں ہے کیا کروں
وہ غم کہ دے چکا ہوں جسے بارہا شکست
پھر دل سے جوشِ دست و گریباں ہے کیا کروں

جشنِ اِستقلال

(۱)

سنہ ۱۹۴۸ء

نیرنگیٔ زمانہ سے مانا کہ آج کل،

خود اپنے ہی لہو میں نہائے ہوئے ہیں ہم

دُشمن بھی جس کو دیکھ کے دِل میں اُداس ہیں،

اِس طرح دوستوں کو ستائے ہوئے ہیں ہم

جس کو اِس آسمان پہ رکھ دیں تو چیخ اُٹھے

شانوں پہ وہ پہاڑ اُٹھائے ہوئے ہیں ہم

یہ بھی عجب طلسم ہے اے دَورِ زِندگی

اَپنوں کی انجمن میں پرائے ہوئے ہیں ہم

لیکن اِن آفتوں کے تَسَلسُل کے باوُجوُد
دَورِ طَرَب سے آس لگائے ہُوئے ہیں ہَم

(۲)

بھُولا ہُوا ہے اَبلَقِ اَیّام شوخیاں
پٹڑی کُچھ ایسے ڈھب سے جَمائے ہُوئے ہیں ہم
جس سے گُذر چُکے ہیں قیامَت کے کارواں،
دُھونی اُسی گلی میں رَمائے ہُوئے ہیں ہم
جن کی ہَر اک شِکَن میں بھنوَر تھے فَساد کے
اُن گیسوؤں کو پھر سے بَنائے ہُوئے ہیں ہم

جن تفرقوں نے خون کے دریا بہائے تھے
اُن تفرقوں کا خون بہائے ہوئے ہیں ہم

ہر وہ کرن، فضا پہ جو برسا رہی تھی آگ
اُس کو رگِ بہار بنائے ہوئے ہیں ہم
ہاتھوں میں سازِ وحدتِ انساں لیے ہوئے
نقشِ دوئی کو دل سے مٹائے ہوئے ہیں ہم
گلزار کا ہے خون کے دھارے سے راستہ
اس نکتۂ حیات کو پائے ہوئے ہیں ہم

پُر ہول زلزلوں کی اُکھڑنے لگی ہے سانس

کچھ یوں قدم زمیں پہ جمائے ہوئے ہیں ہم

(۳)

یہ جشنِ حُرّیت ہے — بس اے یادِ رفتگاں

ہم کو نہ چھیڑ — سوگ بڑھائے ہوئے ہیں ہم

یہ وقتِ رقص و رنگ ہے اے لیلیٰ حیات

ہاں، تان اُڑا کہ ساز مِلائے ہوئے ہیں ہم

وُہ رسمِ نامُراد، کہ تقویٰ کہیں جسے،

اُس رسم کا جنازہ اُٹھائے ہوئے ہیں ہم

ہاں جام دے مُغاں کہ تری بارگاہ میں
بادَل کی طرح جھُوم کے آئے ہُوئے ہیں ہم

ہاں خیمہ زَن ہو، مہر و محبّت کے بادَلو،
نفرَت کی بھَٹّیوں کے تپائے ہُوئے ہیں ہم

ہاں جھُول بے جھجک کہ تُجھے لیلیٰ وَطَن
جھُولے ہزار بار جھُلائے ہُوئے ہیں ہم

رِندوں کے ساتھ ناچ، کہ اے زندگی تُجھے
اِن اپنی اُنگلیوں پہ نَچائے ہُوئے ہیں ہم

کہتے ہیں جِن کو شَمس و قَمر عُرفِ عام میں
سو بار وُہ پَتنگ اُڑائے ہُوئے ہیں ہم

جس میں ہے ایک چاند سا مُکھڑا چھپا ہُوا
چُٹکی میں وُہ نقاب اُٹھائے ہُوئے ہیں ہم

اے سروِ ناز و شاخِ طرب شوخ مُغبچے
لچکا کمر کہ وجد میں آئے ہُوئے ہیں ہم

اے آسمان دیکھ کہ اِن گردشوں پہ بھی
دُھومیں تری زمیں پہ مچائے ہُوئے ہیں ہم

آواز دے رہی ہے ہمیں کس لئے بہشت
ہندوستاں میں خیمہ لگائے ہُوئے ہیں ہم

سمجھے ہُوئے تھے ہم کو جو بے ہوش و بے خبر
اُن سے کہو کہ ہوش میں آئے ہُوئے ہیں ہم

ہم پر— جو کہہ رہے تھے— کہ چھائی ہوئی ہے موت

وُہ دیکھ لیں کہ موت پہ چھائے ہوئے ہیں ہم

آندھی اگر اُٹھی ہے، اُٹھے جوش لاکھ بار،

سینوں میں شمعِ سُرخ جلائے ہوئے ہیں ہم

دعوتِ انقلاب

۱۹۴۶ء

اُٹھ کہ اِن تاریکیوں میں سُرخیاں پیدا کریں
اِس زمیں کی پستیوں سے آسماں پیدا کریں
چھید کر رکھ دے جو نازِ کج کُلاہی کا جگر،
وُہ نکیلا تیر، وہ بانکی کماں پیدا کریں
سَطح ہو جِس کی مُسطَّح، فَرش جِس کا بے شکن
آ، کہ اب وُہ دِل نشیں ہندوستاں پیدا کریں
اُٹھ، کہ اِس داغِ جگر سے جنم دیں خورشید کو،
آ، کہ اِس چینِ جبیں سے کہکشاں پیدا کریں

زرفشاں ہیں خونِ دہقاں سے امیروں کے چراغ
اُٹھ، کہ دہقاں کے نفس سے آندھیاں پیدا کریں

اُٹھ، کہ بے چھائی ہواؤں کو بنا لیں ناخدا
آ، کہ بو راتے بھنور سے کشتیاں پیدا کریں

پائے بے نعلین سے ٹھکرائیں تاج و تخت کو،
فرقِ بے افسر سے چتر و آستاں پیدا کریں

اُٹھ، کہ دوشِ برق پر ڈالیں بنائے آشیاں،
آ، کہ بادِ بے اماں سے بادباں پیدا کریں!

نگارانِ مُردہ

۱۹۴۵ء

اے غزالانِ دشتِ سرو و نسیم [۱]

اے فنا دیدہ مہ وشو، تسلیم!

تُم میں سلمےٰ کوئی، کوئی لیلےٰ

تُم ہو اور زیرِ خاک، واویلا

وُہ مہک ہو جو لعلِ خنداں میں

سر ٹپکتی پھرے بیاباں میں!

جِن پہ ہو ناز و عشوہ کی بُنیاد

وُہ عناصِر ہوا میں ہوں برباد!

[۱] اِسی نوعیت کے چند اشعار، مُدّت ہُوئی، کسی پُرانی مثنوی میں نظر سے گُذرے تھے، مُمکن ہے اِن اشعار میں کہیں کہیں اُن سے مُماثلت ہو گئی ہو۔

جس پہ ہو شبنم و صبا تک بار

اُس لچک پر ہو خاک کا اَنبار!

جسم تُلتے ہوں جن کے پھولوں میں

اُن کے ذرّے اُڑیں بگولوں میں

جس میں غلطاں ہو موجِ ناز و نیاز

موت کا دوش اور وہ زُلفِ دراز

لعلِ جاں بخش و اِبتسامِ جمیل

ہو شگافِ قبور میں تبدیل

تُم پہ مبنی تھا ذوقِ جامہ دری

گریۂ شام و نالۂ سحری

جب تُمھاری نِگاہ جُھکتی تھی،

کِتنے سینوں میں سانس رُکتی تھی

کِتنے جی دَفعتاً ٹھہرتے تھے،

کِتنے جیتے تھے، کِتنے مَرتے تھے

اے نِگارانِ خیمہ ہائے گُلاب[1]

کَعبہ ہائے مُرادِ چَنگ و رَباب

گُل رُخانِ بہشتِ رَعنائی

اے بُتانِ حَریمِ بُرنائی

حَیف اے دُخترانِ رَنگ سَحاب

شاہدانِ شَراب و شِعر و شَباب

[1] "گُل" کے معنی میں اب یہ لفظ عام ہو چکا ہے، اِضافت گو تو اب ہندی الفاظ کے ساتھ بھی

اے گہر ہائے شبنم دُربار،
اے صنم ہائے شاعرانِ کبار
اے نجُوم سپہر حُسن وشباب
تُم ہو اور نذرِ صرصر وسیلاب
کاش رُک جائے موت کا دھارا
چڑھ کے اُترے نہ زیست کا پارا
کاش بن جائے صِرف ایک گُماں
"آیۂ کلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَان"
کاش رُوئے خواص ورُوئے عوام
بَن سکے "وجہِ ربِّ ذوالاکرام"

کاش مرنا حرام ہو جائے

زندگی کو دوام ہو جائے

رقص فرمائے آب و تاب کے ساتھ

زندگی دائمی شباب کے ساتھ

میرے بعد

۱۹۴۷ء

نہ وُہ الفاظ کے نغمے، نہ وُہ معنیٰ کا سرود
گنگ ہے مُطربِ اندازِ بیاں میرے بعد

تیر دِل پر وُہ لگا ہے کہ لچکتی ہی نہیں!
آبروئے شِعر کی گُل ریز کماں میرے بعد

پھر اُلوہیّتِ اِنساں کا تصوُّر ہے خجِل
پھر جبینوں پہ ہیں سجدوں کے نِشاں میری بعد

بے جِھجک ہو کے اُٹھا یا ہی پھر آورد نے سر
کُھل کے گونجی ہے پھر آوازِ اذاں میری بعد

پھر حقایق سے ہیں مصروفِ تمسخرِ اوہام
پھر یقیں پر متبسم ہے گماں میرے بعد

زندہ افکار کا پرتو نہ رہا ذہنوں پر
مردہ ہے انجمنِ دیدہ وراں میرے بعد

زرد ہے چہرۂ گل رنگ نگارِ دانش
تیرہ ہے محفلِ صاحب نظراں میرے بعد

وائے تقدیر کہ پھر عقل و جنوں کے مابین
کوئی باقی نہ رہا رابطۂ نہاں میرے بعد

اپنے الفاظ کی میت کو سرِ دوش اٹھائے
محوِ فریاد ہے سلمائے زباں میرے بعد

کروٹیں شام سے تا صُبح بدلتے ہیں نجُوم

یوں دھڑکتا ہے دِلِ زُہرہ وشاں میرے بعد

نہ رہا کوئی ادا سنجِ حسینانِ جہاں،

سر بہ زانو ہیں حسینانِ جہاں میرے بعد

آخری مُشتری جنسِ جوانی نہ رہا

بند ہے غُرفۂ خوبانِ جہاں میرے بعد

پڑ گئے قُفل، اداؤں کے صنم خانوں میں

سرنگوں ہے علمِ نازِ بُتاں میرے بعد

ہو گیا قحطِ خریداریِ مے کے باعث

چشمِ عالم میں سُبک، رطلِ گراں میرے بعد

چاندنی تنگ ہے خرابات میں دُھندلی دُھندلی
یوں سیہ پوش ہیں رندانِ جہاں میرے بعد

اَب کسے قدر کھنکتے ہوئے پیمانوں کی
بند ہے کارگہِ شیشہ گراں میرے بعد

آخری شمعِ خرابات ہوئی ہے خاموش
اٹھ رہا ہے دلِ ساقی سے دھواں میرے بعد

اہلِ ماتم کا خرابات سے نکلا ہے جلوس
زیرِ سر کردگیِ پیرِ مغاں میرے بعد

اِک اُداسی ہے مہکتے ہوئے بستانوں میں
اِک اندھیرا ہے سرِ آبِ رواں میرے بعد

کس کو بخشے علمِ ہمّتِ گردوں شکنی؟
چشمِ گیتی ہے بہر سو نگراں میرے بعد
حیف اے خسروِی کا کُل وکونین وکتاب
کس کو سونپیں گے ترا طبل ونشاں میرے بعد
حیف یہ صاعقہ و صرصر و سیلاب وسموم
کس کے آغوش میں پائیں گے اماں میرے بعد
سر بہ زانو ہیں اِمامانِ خرابات اے جوشؔ
کون ہو قبلۂ رندانِ جہاں میرے بعد

نغمۂ سحری

۱۹۴۷ء

چٹک رہی ہیں فضائیں۔ کشودِ راز کریں،
اٹھ اے ندیم کہ دِل کا دریچہ باز کریں

چمن میں چھیڑ کے رودادِ گریۂ محمود،
گلوں سے تذکرۂ خندۂ ایاز کریں

فضائے عرش سے بالا ہیں منزلیں جن کی
تصوّرات کے اُن شہ پروں پہ ناز کریں

مچل مچل کے سرِ آب کہہ رہے ہیں نجوم
کنارِ شوق سے جلوے نہ احتراز کریں

گُلِ مُراد سے دامن بھرا رہے اُن کا،
جو شاہ اپنے گداؤں کو سرفراز کریں
ستارۂ سحری کی دمک ہے غنچوں پر
تصوّرِ نظرِ محرمانِ راز کریں
چٹک رہے ہیں شگوفے، سنک رہی ہے نسیم
حدیثِ زُلف سے آ، زِندگی دراز کریں
بٹھا کے عشق کو محبوبیت کی مسند پر،
کسی کے ناز کو آمادۂ نیاز کریں
ندیم، آکہ بہ شُکرِ مذاقِ جامہ دری
دُعائے دولتِ حسنِ جنوں نواز کریں

کُھلے ہوئے ہیں ستاروں میں غُرفہ ہائے جمال
اُٹھا نگاہ کہ سیرِ حریمِ ناز کریں
نُجُوم کانپ رہے ہیں یہی تو وقت ہے جوشؔ
کہ تازہ سُنّتِ پیشینِ سوز و ساز کریں

یاد کرو

۱۹۴۷ء

معاشرو — وہ رباب و چغانہ یاد کرو
حیاتِ جوش کا رنگیں زمانہ یاد کرو

جُھکی ہوئی تھی ادب سے جبینِ ہفت افلاک
وہ رِفعتِ سرِ بے آستانہ یاد کرو

در آئی تھی کبھی تنہا جو قلعۂ دِیں میں
وہ طُرفہ جُرأتِ پیغمبرانہ یاد کرو

جو پُشتِ عرش پہ یادش بخیر، بولا تھا
آئینِ فرش کا وہ تازیانہ یاد کرو

وُہ ضربِ عقل، بہ ایمائے داوریٔ بشر
بہ فرقِ بندگیٔ ابلہانہ یاد کرو!
جہاں زمانہ شِکن خسروی لرزتی تھی
وُہ اک فقیر کی بزمِ شہانہ یاد کرو
کبھی جو تھا سرِ ہستی پہ خیمۂ مستی،
وُہ ہاؤ ہُو وُہ خروشِ مُغانہ یاد کرو
جبینِ وقت پہ غلطاں ہے جس کی لَے اب تک
وُہ زِندہ زمزمۂ شاعرانہ یاد کرو!
بھرا تھا جس میں ترنُّم ضمیرِ ایماں کا
وُہ شور و غُلغُلۂ کافرانہ یاد کرو

نقاب اُٹھائے جہاں نرم چٹکیوں میں نگار
شریکِ رقص تھے وہ شامیانہ یاد کرو
شمیمِ عود و نشاطِ وجود و ذوقِ نمود،
رواقِ شیشہ و رقصِ شبانہ یاد کرو!
مزارِ جوشؔ پہ سجدے کرو، درود پڑھو
حقوقِ رہ بریٔ مخلصانہ یاد کرو!

انجام

۱۹۴۷ء

کل چھلکتے تھے پیالے ، آج خالی جام ہے

وہ دمکتی صبح تھی ، یہ جھلملاتی شام ہے

کل گلستاں تھا ، گلابی تھی ، صنم تھے ، ساز تھا

آج اگر کچھ ہے تو ، لے دے کر ، خدا کا نام ہے

کل روپہلی چاندنی تھی ، اور سنہری کاکلیں[۱]

آج مہرِ زرد رُو ہے ، چرخِ نیلی فام ہے

کل خروشِ صد ترنم ، اک یقینی امر تھا

آج امیدِ یک تبسم بھی خیالِ خام ہے

۱؎ اُن کا کلوں کا ، سیاہ نہیں ، سنہرا رنگ تھا۔

کل نگاہِ مہر تھی اک جزوِ معمولاتِ عام
اب خیالِ جور بھی منجملۂ اوہام ہے
کل تھی جو موجِ محبت نرگسِ بیمار میں،
اب ہے وہ موجِ مروت، اور برائے نام ہے
عقلِ اوّل کانپتی رہتی تھی جس کے روبرو
آج وہ دیوانگی خود لرزہ بر اندام ہے
گونجتی رہتی تھی جس میں سرخوشی و زندگی
آج ارمانوں کی اُس محراب میں کہرام ہے
اک جہانِ حسن تھا جس کے پروں کی چھاؤں میں
آج وہ ذوقِ نظر خود مرغِ زیرِ دام ہے

دُھوم سے نِکلا تھا شہرِ ناز میں جس کا جُلوس

آج اُس آغاز میں بربادیٔ انجام ہے

اب کُھلا، افسُردہ مژگانِ تر ہیں زمزمے

اب کُھلا بربط، فُغاں کا اک کھنکتا نام ہے

اِس سُلگتی زِندگانی سے ٹھٹھرتی موت تک

جوشؔ اب کیا سوچتا ہے، زحمتِ یک گام ہے

ہمارے فرائض

سنہ ۱۹۵۰ء

کس سے کہیں کہ اب ہے یہ فرمانِ روزگار
اس روحِ شاعری کو بھی غرقِ ہوا کریں
ہم مُخلصین کو یہ ہدایات ہیں، کہ ہم
دل سے دُعائے دولتِ اہلِ ریا کریں
یہ حُکم ہے کہ صدر نشیں جب ہوں زشت رُو
ہم سب بلند نعرۂ صلِّ علیٰ! کریں
اربابِ علم پر بھی نچھاور کریں دماغ
جُہّال پر بھی جانِ گرامی فدا کریں!

اَصحابِ کاسہ کو بھی بنائیں رفیقِ ساز

اَرباب کیسہ کو بھی شریکِ غنا کریں

محرابِ داوری میں بھی ہوں آکے نعرہ زن

دَر ہائے بندگی پہ بھی جا کر صدا کریں

راتوں کو روحِ ارض و سما کا بٹائیں ہات

اور دِن کو اہلِ خانہ کی حاجت روا کریں

ہر شب کو بارگاہِ مُغاں کا کریں طواف،

ہر صُبح کو نمازِ معیشت ادا کریں

ہر شام کو ہو بادہ و ساغر کی جستجو

ہر صُبح کو تجسسِ نان و غذا کریں

راتوں کو زیبِ فرق کریں تاجِ خسروی

اور دِن کو زیبِ دوش قبائے گدا کریں

خوبانِ شہر کے بھی دَوامًا اُٹھائیں ناز

اربابِ قہر سے بھی مُسلسل وفا کریں

دستورِ سروری کے بھی ہوں منقبت گُذار

آئینِ چاکری کی بھی مدح و ثنا کریں

بابِ حریمِ حکمتِ مُحکم بھی کھٹکھٹائیں

دروازہ ہائے آزرِ اعظم[1] بھی وا کریں

[1] حضرتِ آزرِ اعظم جلّ جلالہٗ۔

راتوں کو ہوں خدا سے بھی خواہانِ بندگی

اور صبح کو پرستشِ خلقِ خدا کریں

جوشؔ اِن تمام دِل کے پھپھولوں کے ساتھ ساتھ

جب ہوں دماغ میں بھی خراشیں تو کیا کریں

وہی رفتار

۱۹۵۰ء

زہے اقبالِ تلخی و تُرشی

آج بھی سرنگوں ہے قند و نبات

اب بھی جولاں ہے قہر کا خورشید

اب بھی لرزاں ہیں مہر کے ذرّات

اب بھی تاباں ہیں جور کے آثار

اب بھی دُھندلے ہیں لُطف کی آیات

اب بھی، نامِ خُدا، خروشاں ہے

ذوقِ پیکار و کاوشِ غزوات

اَب بھی حاوی ہَیں عِلم پر اَوہام
اَب بھی طاری ہَیں عَقل پر جَذبات[۱]

آج کل بھی سَرِ مکاتِب پر،
مارتا ہے خرِ معا بدلات

اَب بھی پھٹکارتا ہے چُٹیا کو،
پَنڈتِ بَد نہاد و خوش اوقات

اب بھی ٹُنکارتا ہے مَسجد میں
شَیخ داڑھی پہ پھیر پھیر کے ہات

"خوفِ یزداں" ہے اب بھی دِل سے قرِیب
حُبّ اِنساں ہے اَب بھی دُور کی بات

[۱] اب اِس قبیل کی جَمعوں کو ماننا ہی پڑیگا۔

عالموں کا نہیں مقام کوئی
جاہلوں کے رفیع ہیں درجات
باغِ عالم پہ خون برسانے
اب بھی آتی ہے دھرم کی برسات
اب بھی ہے ایک سانس لیتی موت
زندہ درگور آدمی کی حیات
اب بھی ہوتی ہے دھوم سے ہر آن
شاخِ آہو پہ عاشقوں کی برات
اب بھی ہے صحنِ قصرِ آدم میں
آہ کا خیمہ، آنسوؤں کی قنات

آج بھی صِدق ہے گُناہِ عَظیم،
آج بھی حَق ہے رہنِ تعزیرات
شامیانہ حُسینِ اَعظم کا،
نَصب ہے آج بھی کَنارِ فُرات
آج تک آدمی کی سَختی سے
آدمی کو نہیں ملی ہے نَجات
کِس قدَر رہ گئی ہے اَب باقی
اے مری زِندَگی کی لمبی رات؟

اَوہام و عقاید

۱۹۳۹ء

حیف دورِ بندگی میں کس کو سمجھاؤں کہ ہے
صرف رُوحِ آدمیّت ہی اِلٰہُ العالمیں
حیف حرفِ حق سے اب تک برسرِ پیکار ہے
عالمِ دینِ مَتین و مُفتیٔ شرعِ مُبیں
حیف اَوہام و عقائد کے رہیں بازار میں
آج تک نورِ حقائق کی کوئی قیمت نہیں
عقل کی توہین ہے عرشِ بریں کا اِحترام
آکہ اب ڈالیں بنائے سطوتِ فرشِ مُبیں

دِین کے قَدموں پہ قرنوں تک یہ دُنیا جُھک چکی،

آکہ اب دُنیا کے قَدموں پر جُھکا دیں فرقِ دیں

قیدیوں کا حملہ

۱۹۵۰ء

آرے مُنھ اندھیرے یہ بے رحم جھونکا
مرے دِل میں اُف کیا مچل کر در آیا
لگا آکے سینے پر اک سرد بھالا،
یکایک مرا قفلِ دِل توڑ ڈالا،
مرے دِل میں تھیں قید جتنی صدائیں
صدائیں، گھٹائیں، ہوائیں، فضائیں
خوشی، چہچہے، جشن، دُھومیں، براتیں
لڑکپن کی صُبحیں، جوانی کی راتیں

نِگاہوں کے افسوں، لبوں کے فسانے
نُکیلے ترنّم، کٹیلے ترانے
بشاشت کے قِصّے، مُصیبت کو دُکھڑے
حبیبوں کے چہرے، حسینوں کی مُکھڑے
یہ سب پا بہ زنجیر تھے، پا بہ گِل تھے
مرے دِل میں پر بستہ و مُضمحل تھے
ارے اُف یہ جھونکا، یہ برچھا، یہ بھالا
یکایک مرا قُفلِ دل توڑ ڈالا!
دریچے کو ماضی کے وا کر کے چھوڑا
مرے قیدیوں کو رہا کر کے چھوڑا

وُہ پرِ بستہ طائر ستم ڈھا رہے ہیں
بصد شور و غُل سر پہ منڈلا رہے ہیں
لیے چہچہوں میں ہزاروں ترانے
فسانوں کے موسم، فسُوں کے زمانے
وُہ ہلچل، وُہ شورش، وُہ رَو، وُہ روانی
شرارہ، چھلاوہ، دِوانی جوانی
وُہ وعدوں کی راتیں، وُہ موجِ چراغاں
وُہ ایفاء کے شانے پہ گیسوئے پیچاں
نگاہیں وُہ بے حرف، پنڈے وُہ کوری
لبوں کے وہ خم، انکھڑیوں کی وُہ ڈوری

وُہ ساحل کے بربط، وہ موجوں کے تارے
وُہ چندن کے بیڑے، وُہ چاندی کے دھارے
وُہ کاغذ کی کشتی، وُہ میٹھے کا چپّو
وُہ مٹھی کے شیشے، وُہ ٹوپی کے جگنو
یہ سب آنسوؤں کو جگانے لگے ہیں
رہا ہوتے ہی چہچہانے لگے ہیں
مری جشنِ ماضی کی اے یادگارو
اُبھارو نہ ڈوبے سفینے اُبھارو
مرے دِل کی شاخوں میں ڈالو نہ جھولے
کہیں پینگ کوئی نہ اب مجھ کو چھو لے

نہ سنکو لڑکپن کی بچھڑی ہواؤ
نہ گرجو جوانی کی برسی گھٹاؤ
مرے دِل کو چھیدو نہ اے غم کے تیرو
سر اپنا اُٹھاؤ نہ ڈوبے جزیرو
نہ چھینو مری عمر مجھ سے نہ چھینو،
عزیزو، رفیقو، حبیبو، حسینو
اُجاڑو نہ پھر سے خدارا اُجاڑو
مرے دِل کی نگری میں خیمے نہ گاڑو
جو میں نے بھلایا ہے، تم بھی وُہ بھولو
کلی بن کے چٹکو نہ اے زرد پھولو!

اِدھر میرے سِہرے کی مہکو نہ آؤ
ڈساؤ، نہ خوشبوٗ سے مجھ کو ڈساؤ
ارے اب نہ مجھ کو محبّت سے دیکھو
نہ یوں جگمگاؤ بزرگوں کے چہرو
مرے پاس آؤ نہ اے غم گسُارو
نہ مارو ارے دِل پہ بھالے نہ مارو
پسینہ میں خود پونچھ لوں گا جبیں سے
وہیں سے ترس کھاؤ یارو وہیں سی
ترانو نہ منڈلاؤ، طبلو، نہ ٹھنکو،
نہ کھنکو شبستاں کے جھاڑو نہ کھنکو!

ارے چاندنی کو نہ پھر سے جگاؤ
اِدھر مست راتو، نہ آؤ، نہ آؤ
چراغو، مرے گھر میں ڈالو نہ ڈیرا
کہیں چونک جائے نہ میرا اندھیرا
پپیہو، گھٹاؤں کے جوڑے نہ کھولو
یہ دِل آبگینہ ہے آہستہ بولو!
ارے نوجوانی کی راتوں کے تارو
پکارو نہ اِس طرح مجھ کو پکارو
شبستانِ عشرت کے عنبر کی لپٹو
ارے یوں چھری لے کے مجھ پر نہ جھپٹو

جھنجوڑو نہ اِس طرح پیہم جھنجوڑو

ارے مُجھ کو چھوڑو، ارے مُجھ کو چھوڑو

اُٹھو سونے والو اُٹھو، جلد آؤ

بچاؤ، بچاؤ، بچاؤ، بچاؤ

لاعلمی

۱۹۵۰ء

درپردہ تعاقب میں ہیں بے مہر شعاعیں
تابِ مہِ تاباں کو یہ معلوم نہیں ہے!

اس رات پہ کل صبح کی دوڑے گی سفیدی
گیسوئے پریشاں کو یہ معلوم نہیں ہے

ہو جائے گا کل رشتہ بپا ذوقِ تماشا
مژگانِ خراماں کو یہ معلوم نہیں ہے

ہر آئینہ ہے سنگِ حوادث کا نشانہ
رُخسارۂ خوباں کو یہ معلوم نہیں ہے

اس مکتبِ عالم میں ہیں کچھ اور سبق بھی
اطفالِ دبستاں کو یہ معلوم نہیں ہے

انکارِ عبادت بھی ہے اک سجدۂ معکوس
سرتابیٔ شیطاں کو یہ معلوم نہیں ہے

دنیا میں ہر آغاز کا ہوتا ہے اک انجام
مستیٔ فراواں کو یہ معلوم نہیں ہے

آئینۂ خورداں پہ ہے ضو پرتوِ نَو کی،
آئینِ بزرگاں کو یہ معلوم نہیں ہے

ہر قصر پہ بجتا ہے زمانے کا ہتھوڑا
نو عمریٔ ایواں کو یہ معلوم نہیں ہے

ہو جائیں گی بے نور کل اِک پیر کی آنکھیں
حُسنِ مہِ کنعاں کو یہ معلوم نہیں ہے

آنے کو ہے کچھ دیر میں طوفانِ ہوا بھی
اربابِ چراغاں کو یہ معلوم نہیں ہے

اوراق زمانے کے اُلٹتی ہے گدائی
دارائی سُلطاں کو یہ معلوم نہیں ہے

اک دشنۂ سرتیز ہے انفاس میں پنہاں
شاید کہ رگِ جاں کو یہ معلوم نہیں ہے

اِک لشکرِ فریاد اُنھیں ڈھونڈ رہا ہے
یارانِ غزل خواں کو یہ معلوم نہیں ہے

دِل میں کہیں باہر سے مسرّت نہیں آتی
اِس وقت تک اِنساں کو یہ معلوم نہیں ہے
پوشیدہ رگِ ابر میں ہیں سُرخ شعاعیں
سرکارِ بہاراں کو یہ معلوم نہیں ہے
کچھ خون کی چھینٹیں بھی ہیں تتلی کے پروں پر
رنگینیٔ بُستاں کو یہ معلوم نہیں ہے
دارائے دوعالم کو نہیں فرصتِ رحمت
شبّیر حسن خاں کو یہ معلوم نہیں ہے

دُہائی

۱۹۵۰ء

سینوں میں شرارے ہیں، زبانوں میں ہیں کانٹے
اصحابِ زمستان و گلستاں کی دُہائی
اُف ہاتھ کو اب ہاتھ سجھائی نہیں دیتا
آبِ قمر و تابِ چراغاں کی دُہائی
اِک عمر سے خاموش ہیں اِس خاک کے طائر
افلاک کے مرغانِ خوش اَلحاں کی دُہائی
اب تک رُخِ گیتی پہ ہے چھائی ہوئی زردی
عہدِ چمن و وعدۂ بُستاں کی دُہائی

ؔ آئینۂ خوردان پہ نہیں پرتوِ اعمال،

اقوالِ روان بخشِ بزرگاں کی دُہائی

پھر خونِ تمنّا کی دمک ہے سرِ مژگاں

تابندگیٔ لعلِ بدخشاں کی دُہائی

اس دور میں جو نبض ہے وہ ڈوب رہی ہے،

موجِ نفسِ عیسیٔ دوراں کی دُہائی

اب ہات میں دامن، نہ ہواؤں پہ گریباں

نازِ فلک و عشوۂ ترکاں کی دُہائی

ہر آنکھ میں آنسو ہیں، تو ہر سانس میں تلخی

شبنم کی دُہائی، شکرستاں کی دُہائی

ؔ افسوس کہ "بزرگوں" نے "خوردوں" سے جو وعدے کئے تھے، انھیں جھٹلا دیا گیا۔

ہستی کی جو بستی ہے وُہ ہے مرکزِ پستی
مہتابِ سرِ بامِ رگِ جاں کی دُہائی
مُدّت سے پراگندہ ہے مجموعۂ عالم،
جمعیّتِ گیسوئے حسیناں کی دُہائی
اب ہستی و مستی کو ترستا ہے زمانہ
یارانِ سیہ مست و غزل خواں کی دُہائی
چھلکی ہوئی آنکھوں میں زمیں ڈوب رہی ہے
اوجِ فلک و جلوۂ خوباں کی دُہائی
اب تاجِ بصارت نہیں زیبِ سرِ یعقوب
طرفِ کُلۂ یوسفِ کنعاں کی دُہائی

شیون کے بگولوں میں گدا محوِ فغاں ہے
رامشگریِ خیمۂ سلطاں کی دہائی

پیاسوں کا جگر خون ہے اک بوند کی خاطر
آبِ طرب و چشمۂ حیواں کی دہائی

فغفوریتِ اہلِ ہوس تخت نشیں ہے
جمہوریتِ حضرتِ انساں کی دہائی

آشفتگیٔ بام و در ــــ العظمۃ للہ
آسودگیٔ گورِ غریباں کی دہائی

خار و خس و خاشاک ہیں پھر بستر پرخاش
نہر و چمن و سنبل و ریحاں کی دہائی

یہ صبح کا تارا ہے کہ دِل ڈوب رہا ہے،
اے حُسن، تری سُستیٔ پیماں کی دُہائی

رِم جھم

۱۹۵۰ء

(۱)

سنکتے جھونکوں میں زندگانی، کھنکتی بوندوں میں دل ستانی

زمینِ طوفانِ شادمانی، تو آسماں سیلِ کامرانی

چمک رہے ہیں دواں فسانے، گرج رہی ہے رواں کہانی

شراب، کھلتا ہوا شگوفہ، شباب کھلتی ہوئی کمانی

فلک غزل خواں فضا پر افشاں ہوا خروشاں، گھٹا دُخانی

اُٹھو، کہ رِم جھم برس برس کر، بجا رہا ہے سِتار پانی

بجا رہا ہے سِتار پانی، بجا رہا ہے سِتار پانی

اُٹھو کہ رِم جھم برس برس کر، بجا رہا ہے سِتار پانی

(۲)

گھٹا، فضا کو گھما رہی ہے، ہوا، زمیں کو پھٹک رہی ہے

فضا دما دم اُدھڑ رہی ہے، ہوا پیا پے درک رہی ہے

فلک کو لرزہ چڑھا ہوا ہے، زمیں کی چھاتی دھڑک رہی ہے

سیاہیوں کی تہوں میں بجلی ٹھہر ٹھہر کر لپک رہی ہے

نکل نکل کر چمک رہی ہے غلاف سے تیغِ اصفہانی

اُٹھو کہ رِم جھم برس برس کر بجا رہا ہے ستار پانی

بجا رہا ہے ستار پانی ——— بجا رہا ہے ستار پانی

اُٹھو کہ رِم جھم برس برس کر بجا رہا ہے ستار پانی

(۳)

شرارہ خو تیغِ آسماں کو سیاہ ناگن نگل رہی ہے

مچل مچل کر پلٹ رہی ہی، پلٹ پلٹ کر مچل رہی ہے

ہوائیں انگڑائی لے رہی ہیں، پھوار پہلو بدل رہی ہی

بلندیوں سے برس رہی ہی تو پستیوں سے اُبل رہی ہی

شراب ریزی، شباب خیزی شمیم بیزی، شکر فشانی

اُٹھو کہ رِم جھم برس برس کر بجا رہا ہے ستار پانی

بجا رہا ہی ستار پانی ـــــــــ بجا رہا ہی ستار پانی

اُٹھو کہ رِم جھم برس برس کر بجا رہا ہے ستار پانی

(۴)

رجز سُناتی ہُوئی گھٹا ہے، مَلار گاتی ہُوئی جھڑی ہے

رقیق چھڑیاں ہوا پہ رقصاں، چھڑی سے اُلجھی ہُوئی چھڑی ہے

فلک نہایا ہوا کھڑا ہے، زمین ڈوبی ہُوئی پڑی ہے

یہ وُہ چھلکتا ہُوا سماں ہے، یہ وُہ برستی ہُوئی گھڑی ہے

ہر اک دقیقے پہ جس کے قرباں نشاطِ صد عمرِ جاودانی

اُٹھو کہ رِم جھم برس برس کر، بجا رہا ہے سِتار پانی

بجا رہا ہے سِتار پانی ——— بجا رہا ہے سِتار پانی

اُٹھو کہ رِم جھم برس برس کر بجا رہا ہے سِتار پانی

(۵)

فسردہ ہے عقلِ پاک داماں، شگفتہ ہے عشقِ فتنہ ساماں

قفس میں ہو نانیانِ دوراں، چمن میں اربابِ نجد رقصاں

شیوخِ مکتب، غریقِ حرماں، ہواؤں پر دامن و گریباں

کتاب آزردہ و پریشاں، رباب رخشندہ و خروشاں،

سرِ جنوں پر کلاہِ خاقاں، عقول محوِ قصیدہ خوانی!

اُٹھو کہ رِم جِھم برس برس کر، بجا رہا ہے سِتار پانی

بجا رہا ہے ستار پانی ——— بجا رہا ہے ستار پانی

اُٹھو کہ رِم جِھم برس برس کر بجا رہا ہے سِتار پانی

(۶)

نشیب کو تھپ تھپا رہا ہے، فراز کو گُدگُدا رہا ہے

گھٹا کا دامن جھٹک کر دُھوئیں میں شمعیں جلا رہا ہے

سُروں میں تانیں جگا جگا کر، دِلوں میں دُھومیں مچا مچا رہا ہے

شرابیوں کو نچا نچا کر، گلابیوں کو جُھکا رہا ہے،

وُفورِ آہنگِ روحِ دوراں، سُرورِ گلبانگِ زندگانی

اُٹھو کہ رِم جھم برس برس کر بجا رہا ہے سِتار پانی

بجا رہا ہے سِتار پانی ——— بجا رہا ہے سِتار پانی

اُٹھو کہ رِم جھم برس برس کر بجا رہا ہے سِتار پانی

(۷)

فضائیں ہیں مضطر و خروشاں، ہوا گھٹائیں بپا ہیں جنگیں

ہوائیں پیچیدہ آرزوئیں، گھٹائیں اُلجھی ہوئی اُمنگیں،

یقین حیران و رشتہ برپا، گمان بھرتا ہوا اُشلنگیں،

سحاب کے حلقہ ہائے ترمیں، رواں دواں پر فشاں ترنگیں

چٹک رہی ہیں رمیدہ لمحے، تھرک رہی ہے حیاتِ فانی

اُٹھو کہ رِم جھم برس برس کر بجا رہا ہے ستار پانی

بجا رہا ہے ستار پانی —— بجا رہا ہے ستار پانی

اُٹھو کہ رِم جھم برس برس کر بجا رہا ہے ستار پانی

(۸)

تموّجِ بحرِ کامیابی، تلاطمِ رنگِ نیم خوابی،
فلک کی ہر جنبش اضطرابی، فضا کی ہر کروٹ انقلابی
تمام ارض و سما ربابی، تمام کون و مکاں شرابی
فضائے ترکی، عبا سحابی، ہوائے نم کا دوشالہ آبی
نشاط کی آب جو گلابی، حیات کا آبشار دھانی
اُٹھو کہ رِم جھم برس برس کر بجا رہا ہے ستار پانی
بجا رہا ہے ستار پانی ——— بجا رہا ہے ستار پانی

اُٹھو کہ رِم جھم برس برس کر بجا رہا ہے ستار پانی

(۹)

مہک رہا ہے زمیں کا گلشن، بہک رہا ہے فضا پہ ساون،
ہوائے بے باک لرزہ افگن، دھوئیں کی رو میں دیئے سے روشن
فضا میں اُلجھن، ہوا میں سن سن، دمک میں جوبن، گرج میں دھڑکن
جھنن جھنن جھن جھنن جھنن جھن، دھنن دھنن دھن گھنن گھنن گھن
قضا گریزاں، قدر رمیدہ، زمانہ وحشی، فضا دِوانی
اُٹھو کہ رِم جھم برس برس کر بجا رہا ہے سِتار پانی
بجا رہا ہے سِتار پانی ——— بجا رہا ہے سِتار پانی

اُٹھو کہ رِم جھم برس برس کر بجا رہا ہے سِتار پانی

(۱۰)

سیاہ بادل گرج رہے ہیں، پہاڑ سارے دہل رہے ہیں،
تمام جل تھل بھرے ہوئے ہیں، جہاز خشکی میں چل رہے ہیں
بھنور نکالے ہوئے ہیں آنکھیں، تمام دریا اُبل رہے ہیں!
تمام نہریں رواں دواں ہیں، تمام نالے اُچھل رہے ہیں
زہے تموّج زہے تگاپو، زہے تلاطم، زہے روانی
اُٹھو کہ رِم جھم برس برس کر بجا رہا ہے ستار پانی
بجا رہا ہے ستار پانی ——— بجا رہا ہے ستار پانی

اُٹھو کہ رِم جھم برس برس کر بجا رہا ہے ستار پانی

(۱۱)

سحاب کی کروٹوں میں دارو، قلندروں کے لبوں پہ یاہو

تبسّم آئینہ دار لو لو، ترانہ چھٹکا رہا ہے گیسو،

ندی پہ مہ رو، دھوئیں میں آہو، زمیں پہ خوشبو، فلک پہ جگنو

فضا میں نیرو، گھٹائیں جادو، ہوائیں پی ہو، چمن میں کوکو

بجا رہی ہے فضا پہ گھنگرو، نقاب اُلٹے ہوئے جوانی

اُٹھو کہ رِم جھم برس برس کر بجا رہا ہے ستار پانی

بجا رہا ہے ستار پانی ——— بجا رہا ہے ستار پانی

اُٹھو کہ رِم جھم برس برس کر بجا رہا ہے ستار پانی

برسی ہوئی آنکھیں

۱۹۴۹ء

شب کی برسی ہوئی آنکھیں ہیں سحر کو ضو بار،
سرد، شاداب، سبک دوش، سہانی، ہموار
عشق کے ابرِ گہر بار کی دھوئی آنکھیں
جھل جھلاتی ہوئی، نکھری ہوئی، روئی آنکھیں!
آہ کی سان پہ رکھی ہوئی روشن آنکھیں
عشرتِ اشک فشانی کا نشیمن آنکھیں
جادۂ مضطربِ لشکرِ سیّال آنکھیں،
جس پہ تفصیل ہو قربان وہ اجمال آنکھیں!

تر و تابندہ و رخشندہ و تاباں آنکھیں

دلکشِ جلوۂ صبحِ شبِ طوفاں آنکھیں!

غسلِ صحت کی تجلّی سے گُلِ تر آنکھیں

اشک باری کی عبادت سے منوّر آنکھیں!

میں سمجھتا تھا کہ اب رو نہ سکوں گا ای جوش،

دولتِ صبر کبھی کھو نہ سکوں گا ای جوش

عشق کی چھاؤں بھی دیکھوں گا تو کتراؤں گا،

کعبۂ عقل سے باہر نہ کبھی جاؤں گا!

اب رہ عشق کے بازار میں کھوتے ہیں کہیں؟

جنسِ حکمت کے خریدار بھی روتے ہیں کہیں؟

اَب نہ تڑپوں گا کبھی عِشق کے افسانوں پر
اَب جو رُوؤں گا تو روندے ہُوئے اِنسانوں پر
اَب تمنّا پہ نہ ارمان پہ دِل دھڑکے گا
اَب جو دھڑکے گا تو اِنسان پہ دِل دھڑکے گا
اَب نہ یاد آئے گی بھُولے سے کہانی اپنی
خواب میں بھی نہیں دیکھوں گا جوانی اپنی
دِل میں اُٹھے گا نہ اَب دورِ طرب کا تابوت
اَب کوئی نغمہ سُنائے گا نہ راتوں کا سکوت
مسندِ بادہ پہ جب رقص کرے گا مہتاب
اَب نہ ہوگا ئی ساغر میں برافگندہ نقاب

چُبھ سکے گا نہ مرے دِل میں اِشارا کوئی

نوکِ مژگاں پہ نہ دَمکے گا سِتارا کوئی

اَب کوئی شمع جلے گی نہ مری محفِل میں

نَصب ہوں گے نہ اَب اَصنام کے خیمے دِل میں

اَب نہ یاد آئے گا رنگِ لب و رُخسار کبھی

دِل میں گونجے گی نہ پازیب کی جھنکار کبھی

اَب کبھی مُجھ سے نہ رُوٹھا ہُوا دِل بولے گا

اَب تصوُّر کسی گھونگٹ کے نہ پَٹ کھولے گا

اَب پیام آئے گا پھولوں کا نہ گُلشن سے کوئی

اَب نہ جھانکے گا مہ وصال کے رَوزن سے کوئی

یاد آئیں گی نہ بھولی ہوئی باتیں مجھ کو،
اب پکاریں گی نہ ڈوبی ہوئی راتیں مجھ کو
لیکن افسوس کہ یہ سنگِ یقیں ٹوٹ گیا
دامنِ صبر مرے ہات سے پھر چھوٹ گیا
جل اُٹھی روح میں پھر شمعِ صنم خانے کی
خاکِ پروانہ میں آگ آگئی پروانے کی
کھول دی آنکھ غم و درد کی بیماری نے
قفلِ دل توڑ دیا چاند کی ضو باری نے
جس سے راتیں کبھی روشن تھیں وہ جگنو جاگا
چشمِ خوں بستہ میں سویا ہوا آنسو جاگا!

روئے انجام پہ برنائی آغاز آئی
گوشِ یونان میں پھر نجد کی آواز آئی

عقل کی دھوپ ڈھلی عشق کے تارے نکلے
برفِ مہتاب سے پگھلی تو شرارے نکلے

پھر کتابوں سے کوئی روئے کتابی اُبھرا
نقشِ ہر لفظ سے اِک چاند گلابی اُبھرا

کان میں دورِ محبت کے فسانے چھکے
سر پہ بچھڑے ہوئے لمحوں کے ترانے چھکے

جن سے کھلتی تھیں خد و خال کی کلیاں دِل میں
نوجوانی کی اُبھر آئیں وہ گلیاں دِل میں

دِل کی چوٹوں کو، ہواؤں نے دَبا کر دیکھا
پھر جوانی نے مجھے آنکھ اُٹھا کر دیکھا!

یاد، تازہ ہوئی رنگین مُلاقاتوں کی،
تُربتیں دِل میں اُبھر آئیں جواں راتوں کی

بادِ نم ناک چلی رُوح پہ آری بن کر
شبنمِ رفتہ گری دِل پہ کٹاری بن کر

دعوتِ وجد کبھی تھا جو طرب خانے میں
آئیں اُس عود کی لپٹیں مِرے کاشانے میں

شاخِ پژمُردہ پہ مُرغانِ خوش اِلحاں بولے
ایک مُدّت سے جو گونگے تھے وہ ارماں بولے

عِشق کے طَور، محبّت کے وَتیرے اُبھرے
دِل میں ڈوبی ہُوئی یادوں کی جزیرے اُبھرے
تازہ ہونٹوں کا جگاتی ہُوئی جادو آئی
کم سِنوں کے نَفَسِ خام کی خوشبو آئی
کیا کہوں، چرخ سے کیا بارشِ تنویر ہُوئی
کن لحافوں کی مہک آکے بَغَل گیر ہُوئی
جن کی لہروں نے دِکھایا تھا کنارا مجھ کو،
پھر اُنھیں چاندنی راتوں نے پُکارا مجھ کو
نالہ پھر رات کو تا ثابِت وسیّار گیا
ہم تو سمجھے تھے کہ ای جوشؔ یہ آزار گیا[1]

[1] "ہم تو سمجھے تھے کہ ای میرؔ یہ آزار گیا" (میر تقی میرؔ)

درمانِ دردِ انگیز

۱۹۵۰ء

ہاتھ آجاتی ہے جب اِسکاچ کی بوتل کبھی،

تو چھٹک جاتی ہے اِس دِل میں گلابی چاندنی

لیکن اُڑ جاتا ہے صرف اک پل میں اُس کا رنگ و روپ[1]

یوں نگل لیتی ہے اُس کو عاقبت بینی کی دھوپ

عقل کہتی ہے کہ تو اب درخورِ محفل نہیں،

اب کسی صورت بھی تو اِسکاچ کے قابل نہیں!

موت کے گرداب سے مت چھین اپنی زندگی

اے سیہ رو جو تری اوقات ہے ویسی ہی پی

[1] ایسی اضافتیں اب جاری کر دینا چاہیے۔

اِس کا ہدیہ نو روپے تھا ایک دِن بادشہ بہ خیر
ساٹھ ستّر میں بھی اب کھُلتا نہیں یہ قفلِ دیر
یہ نہیں کھنچتی ہے تجھ سے خستہ جانوں کے لِئے
سینت کر یہ جِنس رکھ لے میہمانوں کے لِئے

(۲)

زِندگی کا جبر لیکن اَلحفیظ و اَلاماں
پی رہا ہوں آج میں ظالِم وُہی جِنسِ گراں
جو نہیں اُتری ہے مجھ سے نیم جانوں کے لِئے
سینت کر رکھّا تھا جِس کو میہمانوں کے لِئے

کیونکہ لا سکتا نہیں یارِ خریداری کی تاب
آج قطعاً مول لے سکتا نہیں سستی شراب
آج ہی پر کچھ نہیں موقوف یہ بے چارگی
آئے دِن دیتی ہے میرے در پہ دستک مُفلسی

(۳)

مُفلسی اہلِ ہُنر کے چرخ کی زرّیں شعاع
مُفلسی داناؤں کی میراث، اَدیبوں کی مَتاع
مُفلسی اِملاکِ فن، جاگیرِ اربابِ نظر
مُفلسی اِقبالِ حق، معراجِ تکمیلِ ہُنر

مُفلسی تخئیل کا انجام، جودت کا مآل
مُفلسی تختِ اکابر، تاجِ اربابِ کمال
مُفلسی ہم شاعروں کی دولتِ دُنیا و دیں
مُفلسی پیغمبروں کے طاق کی شمعِ مُبیں
مُفلسی اک دائمی پاداشِ تنویرِ خیال،
مُفلسی اک مُستقل تعزیرِ تخلیقِ جمال
مُفلسی اہلِ حماقت سے جُدا رہنے کا پھل
مُفلسی احساسِ خودداری کا اک ردِّ عمل
مُفلسی اہلِ نظر کی جلد بازی کا صلا،
وقت سے پہلے یہاں تشریف لانے کی سزا

(۴)

ہاں، تو جب ہوتا ہی مجھ پر بے گراں اُس کا عتاب
مجھ گدا کو مفلسی دیتی ہے شاہوں کی شراب
لوگ اِسے پیتے نہیں جب تک نہیں ہوتے امیر
اور میں پیتا ہوں جب قسمت سے ہوتا ہوں فقیر
دوسروں کے واسطے جو شے ہے دولت کا ثبوت
وہ مری دُنیا میں ہے معراجِ عسرت کا ثبوت

(۵)

بوئے گُل رقصندہ ہے اور دامنِ گُل چاک ہے
کس قدر یہ بزمِ آب و گِل بھی حیرت ناک ہے
سر میں جب ہوتا ہے چکّر، رقص کا آتا ہے دور
پھوٹ جاتی ہیں جب آنکھیں دیکھنے لگتا ہوں اور
سونپتی ہے تشنگی صد موجۂ کوثر مجھے
بے زری کی انتہا دیتی ہے آبِ زر مجھے
تیرگی بنتی ہے میرے واسطے تابندگی،
بخشتی ہے موت میرے سر کو تاجِ زندگی
سُست ہوتا ہے قلم تو حرف بنتے ہیں جلی
گُل کی مُرجھاہٹ کے سائے میں چٹکتی ہے کلی

قہر کے فرمان سے ہوتا ہے رحمت کا نزول
باغ میں چلتی ہے جب صرصر تو کھل جاتے ہیں پھول

آندھیاں آتی ہیں تو شاخوں پہ آتا ہے نکھار
خیمۂ فصلِ خزاں میں رقص کرتی ہے بہار

جب بھی ذوقِ کیف کی آنکھوں سے بہتا ہے لہو
ساقیٔ کوثر مری جانب بڑھاتا ہے سبو

لیلیٔ مشکل عطا کرتی ہے آسانی مجھے
بخش دیتی ہے گدائی، تاجِ سلطانی مجھے

لیکن اِس درماں میں لاکھوں درد کے پہلو بھی ہیں
ہم نشیں اِن موتیوں کی آب میں آنسو بھی ہیں!

کلکتہ

سنہ ۱۹۴۷ء

ہائیں یوں زرد، اِس قدر گُم سُم!
سچ بتاؤ علی حُسین ہو تم؟
تُم وُہی ہو علی حُسین جو کل،
بیٹھتے ہی نہ تھے کہیں اِک پَل؟
عطر پوشاک میں لگاتے تھے
مُسکراتے تھے، گُن گُناتے تھے
بمبئی کی فضا سے ہو دِل تنگ؟
اَچھا، اب بیچتے ہو تاش وپتنگ[1]؟

[1] میں سنہ ۱۹۲۱ء میں جب کلکتے گیا تھا، تو علی حسین جو میرے مُلازموں میں سے
ایک خوش وضع اور زِندہ دل اِنسان تھے میرے ہمراہ تھے۔ [2] اب اِن اِضافتوں کو

ہائے نشتر چلا دیا تم نے
یاد کیا کیا دلا دیا تم نے
میرے ہمراہ اک نئی دھج سے،
یاد ہے جب گئے تھے کلکتے؟
ہر نفس اک نیا ترانہ تھا
وہ سنہ[1] اکیس کا زمانہ تھا
زندگانی تھی اک نئی تصویر
سانس میں تھی شراب کی تاثیر
کھینچ کر ہم جو سانس لیتے تھے
جوئے مستی میں ناؤ کھیتے تھے

[1] سنہ ۱۹۲۱ء

نُقرئی، سُرخ، سبز، فالسئی

آسماں تھا نیا، زمین نئی

سادگی میں بھی تھا اَنوکھا پَن،

چار تنکوں کی چھاؤں تھی گُلشن

ٹھنڈے جھونکے جو چھیڑ کرتے تھے

دِن پھبکتے تھے، سِن اُبھرتے تھے

سیکڑوں رنگ تھے نِگاہوں میں

داستانیں تھیں شاہراہوں میں

ہر نَفَس یاسمن میں تُلتا تھا

ہر قدم پر دریچہ کُھلتا تھا

داستانِ جنوں ہوئی تھی شروع
صبحِ چہروں کی ہو رہی تھی طلوع
قید سے آرزوئیں چھوٹی تھیں
کونپلیں ولولوں کی پھوٹی تھیں
غنچہ چٹکا تھا زندگانی کا،
جھٹ پٹا تھا نئی جوانی کا
دھوپ میں بھی تھا ابرِ ساون کا
ہائے پچھلا پہر لڑکپن کا!
رخ پہ تھا آمدِ شباب کا رنگ
برگِ گل کی نمی، شراب کا رنگ

نوجوانی کا روپ چھایا تھا
وقت پر جھٹپٹی دھندلکا تھا
دل نشیں تھی ہوائے کلکتہ
نغمہ تھی ہر صدائے کلکتہ

دورِ ماضی کا وہ جواہر دُرج
ہائے وہ بارگاہِ مٹیا بُرج[1]
پائے تختِ فنونِ لاثانی،
مرکز و محورِ زباں دانی
مسندِ زرنگارِ چنگ و رباب
شمسۂ گنبدِ بلور و حباب

[1] وہ بُرج جہاں فرنگی کی رذالت، طمع اور فریب کاری نے لکھنؤ کے آخری اور فن کار تاجدار حضرت واجد علی شاہ "جانِ عالم" کو قید کیا تھا۔

قبرِ حسنات و مدفنِ برکات

حرمِ رقص و کعبۂ نغمات

مرقدِ آبروئے شعر و سخن

محبسِ تاجدارِ کشورِ فن [1]

حلقۂ گل فشاں تفنّن کا

مقبرہ مرمریں تمدّن کا

وہ لطافت کے کارواں کا غبار

روکشِ خلد لکھنؤ کا مزار

جس کے ذرّات میں مہ و پرویں

آسماں جس میں دفن ہے وہ زمیں

[1] حضرت واجد علی شاہ جانِ عالم

جس کی صرصر میں خفتہ لاکھوں باغ
گُل ہُوا تھا جہاں اودھ کا چراغ
سقف و ایواں میں جس کی گونجی تھی
"جانِ عالم" کی آخری ہچکی
اور وہ دل نشیں عجائب گھر
اور وہ زو[1] کہ عقل تھی ششدر
یاد ہیں وہ رئیس[2] اور مختار[3]
اور وہ بذلہ سنجیِ ابرار[4]
وہ لطیفوں وہ پھبتیوں کی فضا
ہائے وہ صحبتِ امیر چچا[5]

۱؎ ۵۰۰ء – ۲؎ رئیس احمد خاں – ۳؎ مختار احمد خاں – ۴؎ ابرار حسن خاں اثر – ۵؎ امیر احمد خاں ... آبا

اور اُن کے وُہ دِل نشیں فقرے

لوٹ جاتی تھی زِندگی جن سے

اور وُہ نوُرُالحسن[1] بڑے جرنیل

صاحِبانِ مزاح کے سرخیل

دِل لُبھاتے تھے چہچہے جِن کے

دوُر جاتے تھے قہقہے جِن کے

لرزِشِ جوئے شام و گردِشِ جام

تنگ گلیوں میں حُسن کے وُہ خیام

تابِشِ آسمانِ کلکتہ

ہائے وُہ گُل رُخانِ کلکتہ

[1] نوُرالحسن خاں ملیح آبادی

جسم وُہ شُعلہ ہائے جوّالہ
انکھڑیوں میں وُہ سحرِ بنگالہ
ساحلوں پر رواں دواں اصنام
جیسے دریا میں کشتیوں کا خرام
وُہ اشارے، وُہ گات، وُہ تیور
اُف وُہ آنکھیں، وُہ بال وُہ پیکر
اُف وُہ لو، وُہ دمک، وُہ چھوٹ وُہ نور
اُف وُہ کافر جوانیاں بھرپور
وُہ چٹکتی حیات کی کلیاں
وُہ مہک سے بھری ہوئی گلیاں

دِل نشیں وہ زبان بنگالی
گول لہجوں میں ریشمی جالی
نغمہ و رقص کی مُلاقاتیں
جیسے برکھا کی جھومتی راتیں
"سارے گاما" پہ وہ "تنادھن دِھن"
وہ گرجتے بدن، کڑکتے سِن!
ہائے وہ دُخترانِ آئینہ رُو
بریں دوشیزگی کی وہ خوش بو
برہمن میں صنم کو دیکھتی تھیں
کِس تمنّا سے ہم کو دیکھتی تھیں

دُور ہو ہو کے پاس آتی تھیں،
کِس لگاوَٹ سے آنکھ اُٹھاتی تھیں
ہم اِدَھر تھے دَمکتے سونے سے
تُم اُدَھر سانولے سَلونے سے
ہائے کیسی اُلَٹ گئی وہ بِساط
حَیف یہ شامِ غم، وُہ صُبحِ نَشاط
اَب وُہ اَگلی سی آب و تاب کہاں
ہَم کہاں اور وُہ شَباب کہَاں
اَب نہ خادِم ہو تُم نہ ہَم مخدُوم
ہَم اِدھر زار، تُم اُدَھر مغمُوم

کل کا گُل آج خارِ پہلو ہے
کل جو موتی تھا، آج آنسو ہے
وائے بر ربطِ خادم و مخدوم
پھر ملیں گے بھی، یہ بھی کیا معلوم
اَب کہاں سے وُہ روز و شب لائیں
تُم اُدھر جاؤ، ہم اِدھر جائیں
یہ مُلاقات رنگ لائے گی
شب کو تا دُور لے کے جائے گی
جلد یہ داغ دھو سکیں گے نہ ہم
آج کی رات سو سکیں گے نہ ہم

اعترافِ عجز

۱۹۵۰ء

لوگ کہتے ہیں کہ میں ہوں شاعرِ جادو بیاں
صدرِ معنیٰ ، داورِ الفاظ ، امیرِ شاعراں
اور خود میرا بھی کل تک، خیر سے تھا یہ خیال
شاعری کے فن میں ہوں منجملۂ اہلِ کمال
لیکن اب آئی ہے جب، اک گونہ مجھ میں پختگی
ذہن کے آئینے پر کانپا ہے عکسِ آگہی
آسماں جاگا ہے سر میں اور سینے میں زمیں
اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں

جہل کی منزل میں تھا مجھ کو غرورِ آگہی
اتنی لامحدود دُنیا، اور میری شاعری
الاماں آفاق کا دِل اور یہ طغیانِ سوز
اب کھلا مجھ پر کہ اِک طفلِ دبستاں ہوں ہنوز
زُلفِ ہستی اور اِتنے بے نہایت پیچ و خم
اُڑ گیا رنگِ تعلّی، کھُل گیا اپنا بھرم
میرے شعروں میں فقط اِک طائرانہ رنگ ہے
کچھ سیاسی رنگ ہے، کچھ عاشقانہ رنگ ہے
کچھ مناظر، کچھ مباحث، کچھ مسائل، کچھ خیال،
اِک اُچٹتا سا جمال، اِک سربہ زانو سا جلال

میرے کاخِ شاعری کی نیو میں سنگِ فتور
ایک طفلانہ بلوغ، اک کھوکلا سِنِّ شعور
میرے قصرِ شعر میں غوغائے فکرِ ناتمام،
ایک دردانگیز درماں، اک شکست آمادہ جام
گاہ سوزِ چشم و ابرو، گاہ سازِ نائے و نوش،
گاہ خلوت کی خموشی، گاہ جلوت کا خروش
چہچہے کچھ موسموں کے، زمزمے کچھ جام کے
دیرِ دل میں چند ٹکڑے مرمریں اصنام کے
چند زلفوں کی سیاہی، چند رخساروں کی آب
گاہ حرفِ بےنوائی، گاہ شورِ انقلاب

وہ بھی کچھ جاگیردارانہ بہ قولِ ناقداں
بے سواد و بستۂ رسم و رہِ رومانیاں
وصل کے دو چار نغمے، ہجر کی اک آدھ آہ
قعر سے ناواقفیت، سطحِ دریا پر نگاہ
گاہ مرنے کے عزائم، گاہ جینے کی اُمنگ
بس یہی سطحی سی باتیں، بس یہی اوچھے سے رنگ
اتنی اوچھی رنگ سازی سے کھلا جاتا تھا میں
اتنی عبرت ناک سطحیت پہ اتراتا تھا میں
بے خبر تھا میں کہ دُنیا رازِ اندر راز ہے
وہ بھی گہری خامشی ہے جس کا نام آواز ہے

جو یہاں اَظہَر مِن الشَّمس و چراغِ طُور ہے

وُہ درخشاں چیز بھی اِک حلقۂ بے نور ہے

یہ سُہانا بوستاں سَرو و گُل و شَمشاد کا

ایک پَل بھر کا کِھلَنڈرا پَن ہے اَبر و باد کا

ہر ترنُّم ہے دِلِ خوں بستہ کی اِک موجِ زہر

ہر تبَسُّم ہے خراشِ سینہ کی ہلکی سی لہر

شَرم، شوخی کی تھکاوٹ، عشوہ، عجزِ دلربی

ناز، اک رنگیں سہارا، نازُکی اک لاغری

بوئے گُل کیا، ایک عیّارانہ شوخی گرد کی

زمزمے کیا، ایک خوش فِعلی ہے آہِ سرد کی

بَرق، بینائی پر اک ضربِ سحابِ تیرگی
شُعلۂ جوّالہ، قِرطاسِ کتابِ تیرگی

اِس محلِّ آب و گِل میں یہ حیاتِ آدمی
گُربہ کی صِرف ایک پَل بھر مُوش سی بازی گری

اِبتدا و اِنتہا کا عِلم نظروں سے نِہاں،
ٹمٹماتا سا دِیا، دو ظُلمتوں کے درمیاں

جہل کا اک قہقہہ ہر اِدّعائے آگہی
موت کا اک مسخرا پن ماجرائے زِندگی

روشنی بن کر اکڑتا پِھر رہا ہے، بَرملا،
تہ بہ تہ تاریکیوں کا خندۂ دنداں نُما

اَنجُمن میں تخلیئے ہیں، تخلیوں میں انجمن
ہر شکن میں اک کھچاوٹ، ہر کھچاوٹ میں شکن
عام معمولاتِ دُنیا، واقعاتِ صُبح و شام
فکرِ انسانی کے محبس، عقلِ انسانی کے دام
ہر گماں میں اک یقیں سا، ہر یقیں میں سو گماں
ناخنِ تدبیر بھی خود ایک گتھی بے اماں
روشن اُمیدوں کی پیشانی میں غلطاں اَبرِ بیم
ہم سوادِ گیسوئے پُر خم، صراطِ مُستقیم
ایک اک گوشے سے پیدا وُسعتِ کون و مکاں
ایک اک خوشے میں پنہاں صد بہارِ جاوداں

جنگ میں پیغامِ رحمت، سنگ میں پیکِ بہار
پرنیاں میں تیغ کی باڑھ، آب میں آہن کی دھار
لیلیٔ سنجیدگی کے لب پہ سرمستی کا حرف
برف میں شعلے تپاں، شعلوں کی طرّاری میں برف
تخم کے سینے میں غلطاں گلستانوں کے نکات
خاک کی چٹکی میں پر افشاں قوائے کائنات
ہر کرن اِک ابر، ہر تعبیر اِک ژولیدہ خواب
ہر سحر اک ریوِ شب، ہر جلوہ اِک بکرِ حجاب
ہر نمایاں نقش، اک پنہاں فریب ابصار کا
ہر گُلِ شاداب، اِک بہروپ پیاپن خار کا!

ہر خزف الماس، ہر زنجیر تارِ عنکبوت
ہر کلید اِک قفل، ہر جھنکار اِک جولاں سکوت
پیکرِ ہستی پہ ڈھیلا ہے مظاہر کا لباس،
اور میں اُس کی ذرا سی اک شکن سے روشناس
برق کی لہروں کی وسعت، الحفیظ و الاماں
اور میں صرف ایک کوندے کی لپک کا رازداں
رازداں کیا، مدح خواں، اور مدح خواں بھی کم سواد
نابلد، نادان، ناواقف، ندیدہ، نامراد
خارجِ از وہم و گماں ہی عمرِ لیلائے زمیں
اور اک لمحے کی پیمایش پہ میں قادر نہیں

کیوں نہ پھر سمجھوں سُبک اپنے سُخن کے رنگ کو
نُطق نے الماس کے بدلے تراشا سنگ کو

لیلیٔ آفاق اُلٹتی ہی رہی پیہم نقاب
اور یہاں عورت، مناظر، عشق، صہبا، انقلاب

دائمی قدروں کی ہر ساعت گہرپاشی رہی
اور یہاں وقتی مسائل ہی کی عیّاشی رہی

غُرفہ ہائے لعل و گوہر آسماں کھولا کیا
اور میں ریزہ ہائے کوئلے تولا کیا!

ہار رہا ہوں شاید اب اِس تیرہ خلقی سے نجات
کیوں کہ اب پیشِ نظر ہیں عُقدہ ہائے کائنات

کائنات اک کارگاہِ سطوت وکاخِ جلال

جلوہ گر جس کے نقائص میں بھی رُوحِ صد کمال

یہ بھنچی، اُلجھی زمیں، یہ پیچ در پیچ آسماں،

اَلاَماں وَالاَماں وَالاَماں وَالاَماں!

ایک مُنّا سا ستارہ، ایک ننھا سا شرار

یہ تزلزُل، یہ تلاطُم، یہ تموُّج، یہ فشار!

اِک نفس کا تار اور یہ شورِ عمرِ جاوِداں،

اِک گھڑی اور اُس میں زنجیروں کی اِتنی کارواں

اک تبسُّم اور اِتنے خونِ صالح کے نجُوم

ایک مُبہم نقش اور اِتنی شعاعوں کا ہجُوم

ایک اک لمحہ میں اِتنے کاروانِ انقلاب
ایک اک ذرّے میں اِتنے ماہتاب و آفتاب
یہ گرج، یہ برق، یہ طوفاں، یہ صرصر، یہ سموم
بندگانِ چند اور اِتنے خداؤں کا ہجوم!!
لے کی جُنبش اور اِتنے حلقہ ہائے بے شمار
لَے کی کروٹ اور یہ ہنگامہ رقصِ شرار
اک صدا اور اُس میں یہ لاکھوں ہوائی دائرے
جس کے شعبوں کو اگر چُن لے تو دُنیا گونج اُٹھے
ایک پرتو اور فضائے بے کراں پر جست و خیز
اک دِیا اور آندھیوں کی فوج سے گرمِ ستیز

ایک بوند اور ہفت قُلزم کے ہِلا دینے کا جوش
ایک گونگا خواب، اور تعبیر کا اِتنا خروش!

کوہ کی رفعت میں اِتنی پستیوں کے خطّ و خال
کاہ اور اِتنے عناصر کے مساعی کا مآل!

اک ہیولا اور یہ اَشکال و اَسماء کا ہجوم
جہلِ مطلق کے سیہ خانے میں یہ رقصِ علوم

بہرِ یک ساعت، برائے تابشِ یک بامداد
اِتنی سعیِ آب و آتش، اِتنی جہدِ برق و باد

ایک شبنم، اور اِتنے تُند شعلوں کی ترنگ
اک حرف اور اِتنے پہلو، اک نظر اور اِتنے رنگ

اک کلی اور اُس میں صدیوں کی متاعِ رنگ و بو

صرف اک لمحے کی رگ میں اور قرنوں کا لہو!

ہر قدم پر نصب اور اسرار کے اتنے خیام

اور اس منزل میں میری شاعری میرا کلام!

جس میں رازِ آسماں ہے اور نہ اسرارِ زمیں

ایک خس، اک دانہ، اک جو، ایک ذرّہ بھی نہیں

نوعِ انسانی کو جب مل جائے گی رفتارِ نور

شاعرِ اعظم کا تب ہو گا کہیں جا کر ظہور!

خاک سے پھوٹے گی جب عمرِ ابد کی روشنی

جھاڑ دے گی موت کو دامن سے جس دن زندگی

جب قوائے بحر و بر پر آدمی ہو گا سوار
جب بنے گا بندۂ مجبور، الٰہِ روزگار
جب ہماری جوتیوں کی گرد ہو گی کہکشاں
تب جنے گی نسلِ آدم شاعرِ جادو بیاں
فکر میں کامل، نہ فنِّ شعر میں یکتا ہوں میں
کچھ اگر ہوں تو نقیبِ شاعرِ فردا ہوں میں

درسِ جُرأت

سنہ ۱۹۴۹ء

اے سوئی ہُوئی قوم کے بیدار جوانو
اے ہمّتِ مردانہ کے ذی روُحِ نشانو
سو بات کی یہ بات ہے اِس بات کو مانو
جِینے کا جو ارمان ہے تو موت کی ٹھانو

بے غرق ہُوئے کوئی اُبھرتا ہی نہِیں ہے
جو بات پہ مرتا ہے وُہ مرتا ہی نہِیں ہے

بے ذوقِ وغا کوئی تہمتن نہیں بنتا،
بے سلسلۂ برق نشیمن نہیں بنتا!
سونا نہیں تپتا ہے تو کندن نہیں بنتا
جو گھن نہیں کھاتا ہے وہ آہن نہیں بنتا

جو زخم کا شرمندۂ احساں نہیں ہوتا
وہ شیر کبھی شیرِ نیستاں نہیں ہوتا

مرتے جو نہیں عیسیٰ دوراں نہیں بنتے
جو قید نہ ہوں یوسفِ کنعاں نہیں بنتے
آسودہ جو دھارے ہیں وہ طوفاں نہیں بنتے
جو موت سے ڈرتے ہیں وہ اِنساں نہیں بنتے

ساحل پہ کبھی اِذنِ روانی نہیں مِلتا
بے آگ میں کودے ہوئے پانی نہیں مِلتا

بھڑکے نہ اگر آگ تو اُخگر نہیں بنتے،
گھومے نہ اگر چاک تو ساغر نہیں بنتے
تڑپے نہ اگر موج تو گوہر نہیں بنتے
ترشے نہ اگر سنگ تو پیکر نہیں بنتے

تخریب کا جب تک کہ تلاطم نہیں آتا
تعمیر کے ہونٹوں پہ تبسّم نہیں آتا!

کمزور کو آسودگیِ دل نہیں ملتی
بے قیس بنے دولتِ محمل نہیں ملتی
جادوں میں جسے نعمتِ محفل نہیں ملتی
اُس رہروِ نا اہل کو منزل نہیں ملتی

گرداب میں جس شخص کو جینا نہیں آتا
اُس شخص کا ساحل پہ سفینہ نہیں آتا

جب تک کہ ہر اک ذرّہ پرافشاں نہیں ہوتا
اک پھول بھی گلزار میں خنداں نہیں ہوتا
گلشن میں کبھی جشنِ بہاراں نہیں ہوتا
جب تک کہ ہواؤں پہ گریباں نہیں ہوتا

جب تک دلِ یوسف پہ گرانی نہیں آتی
رُخسارِ زلیخا پہ جوانی نہیں آتی

میداں میں اگر سینہ اُبھارا نہیں جاتا
لعنت کا کبھی طوق اُتارا نہیں جاتا
شیروں کی طرح جن سے ڈکارا نہیں جاتا
عزت کی طرف اُن کو پکارا نہیں جاتا

مے خانۂ اکرام میں پینے نہیں دیتی
دُنیا کبھی نامرد کو جینے نہیں دیتی!

رِشوت

سنہ ۱۹۴۹ء

لوگ ہم سے روز کہتے ہیں یہ عادت چھوڑیئے
یہ تجارت ہے خلافِ آدمیت چھوڑیئے
اس سے بدتر لت نہیں ہے کوئی، یہ لت چھوڑیئے
روز اخباروں میں چھپتا ہے کہ رشوت چھوڑیئے

بھول کر بھی جو کوئی لیتا ہے رشوت چور ہے
آج قومی پاگلوں میں رات دن یہ شور ہے

(۲)

کس کو سمجھائیں اِسے کھو دیں تو پھر پائیں گے کیا
ہم اگر رشوت نہیں لیں گے تو پھر کھائیں گے کیا
قید بھی کردیں تو ہم کو راہ پر لائیں گے کیا
یہ جنونِ عشق کے انداز چھُٹ جائیں گے کیا

مُلک بھر کو قید کر دے کس کے بس کی بات ہے
خیر سے سب ہیں، کوئی دو چار دس کی بات ہے

(۳)

یہ ہوس ، یہ چور بازاری ، یہ مہنگائی ، یہ بھاؤ
رائی کی قیمت ہو جب پربت تو کیوں آئے نہ تاؤ
اپنی تنخواہوں کے نالے میں ہے پانی آدھ پاؤ
اور لاکھوں ٹن کی بھاری اپنے جیون کی ہے ناؤ

جب تلک رشوت نہ لیں ہم دال گل سکتی نہیں
ناؤ تنخواہوں کے پانی میں تو چل سکتی نہیں

(۴)

رشوتوں کی زندگی ہے چور بازاری کے ساتھ

چل رہی ہے بے زری احکام زرداری کے ساتھ

پھرتیاں چوہوں کی ہیں بلّی کی طرّاری کے ساتھ

آپ روکیں خواہ کتنی ہی ستم گاری کے ساتھ

ہم نہیں ہلنے کے سُن لیجے کسی بھونچال سے

کام یہ چلتا رہے گا آپ کے اقبال سے

(۵)

یہ ہے ہل والا، وُہ بنیا ہے، یہ ساہوکار ہے
یہ ہے دُکاں دار، وُہ ہے وَید، یہ عطّار ہے
وُہ اگر ٹھگ ہے، تو یہ ڈاکو ہے، وُہ بٹ مار ہے
آج ہر اک گردن میں کالی جیت کا اِک ہار ہے

حیف، مُلک و قوم کی خدمت گُذاری کے لیے
رہ گئے ہیں اک ہمیں ایمان داری کے لیے

(۶)

بھوک کے قانون میں ایمان داری جرم ہے
اور بے ایمانیوں پر شرمساری جرم ہے
ڈاکوؤں کے دور میں پرہیزگاری جرم ہے
جب حکومت خام ہو تو پختہ کاری جرم ہے

لوگ اٹکاتے ہیں کیوں روڑے ہماری کام میں
جس کو دیکھو، خیر سے ننگا ہے وہ حمام میں

(۷)

دیکھیے جس کو دبائے ہے بغل میں وہ چھرا
فرق کیا اس میں کہ مجرم سخت ہے یا بھربھرا
غم تو اس کا ہے زمانہ ہے کچھ ایسا گھردرا
ایک مجرم دوسرے مجرم کو کہتا ہے برا

ہم کو جو چاہیں سو کہہ لیں ہم تو رشوت خور ہیں
ناصحِ مشفق بھی تو اللہ رکھے ، چور ہیں

(۸)

توندوالوں کی تو ہو آئینہ داری، واہ وا
اور ہم بھوکوں کے سر پر چاندماری، واہ وا
اُن کی خاطر صُبح ہوتے ہی نہاری واہ وا
اور ہم چاٹا کریں ایمان داری واہ وا

سیٹھ جی تو خوب موٹر میں ہوا کھاتے پھریں
اور ہم سب جوتیاں گلیوں میں چٹخاتے پھریں

(۹)

خوب، حق کے آستاں پر اور جھکا اپنی جبیں
جائیے رہنے بھی دیجے ناصحِ گردوں نشیں
توبہ توبہ ہم بھڑی میں آ کے اور دیکھیں زمیں
آنکھ کے اندھے نہیں ہیں، گانٹھ کی پوری نہیں

ہم پھٹک سکتے نہیں پرہیزگاری کے قریب
عقل مند آتے نہیں ایمان داری کے قریب

(۱۰)

اس گرانی میں بھلا کیا غنچۂ ایماں کھلے
جو کے دانے سخت ہیں، تانبے کے سکے پِل پلے
جائیں کپڑے کے لیئے تو دام سُن کر دل ہلے
جب گریباں تا بہ دامن آئے تو کپڑا ملے!

جان بھی دیدے تو سستے دام مِل سکتا نہیں
آدمیت کا کفن ہے دوستو، کپڑا نہیں!

(۱۱)

صرف اک پتلون سلوانا قیامت ہوگیا
وہ سِلائی لی میاں درزی نے ننگا کر دیا
آپ کو معلوم بھی ہے چل رہی ہے کیا ہوا؟
صرف اک ٹائی کی قیمت گھونٹ دیتی ہے گلا

ہلکی ٹوپی سر پہ رکھتے ہیں تو چکراتا ہے سر
اور جوتے کی طرف بڑھیے تو جھک جاتا ہے سر

(۱۲)

تھی بُزرگوں کی جو بَنیایُن وُہ بَنیا لے گیا
گھر میں جو گاڑھی کمائی تھی وُہ گاڑھا لے گیا
جِسم کی ایک ایک بوٹی گوشت والا لے گیا
تَن میں باقی تھی جو چَربی گھی کا پِی پل لے گیا

آئی تب رِشوَت کی چِڑیا پَنکھ اپنے کھول کر
وَرنہ مَر جاتے میاں کُتّے کی بولی بول کر!

(۱۳)

پتھروں کو توڑتے ہیں آدمی کے اُستخواں،
سنگ باری ہو تو بن جاتی ہے ہمّت سائباں
پیٹ میں لیتی ہے لیکن بھوک جب انگڑائیاں
اور تو اور، اپنے بچّے کو چبا جاتی ہے ماں

کیا بتائیں بازیاں ہیں کس قدر ہاری ہوئے
رشوتیں پھر کیوں نہ لیں ہم بھوک کے مارے ہوئے

(۱۴)

آپ ہیں فضلِ خدائے پاک سے کرسی نشیں
اِنتظامِ سلطنت ہے آپ کے زیرِ نگیں،
آسماں ہے آپ کا خادِم تو لونڈی ہے زمیں
آپ خود رِشوت کے ذِمّہ دار ہیں فِدوی نہیں

بخشتے ہیں آپ دریا، کشتیاں کھیتے ہیں ہم
آپ دیتے ہیں مواقع رِشوتیں لیتے ہیں ہم

(۱۵)

ٹھیک تو کرتے نہیں بُنیادِ ناہموار کو،
دے رہے ہیں گالیاں گرتی ہوئی دیوار کو
سچ بتاؤں؟ زیب یہ دیتا نہیں سرکار کو
پالیے بیماریوں کو، ماریے بیمار کو

علّتِ رشوت کو اس دُنیا سے رُخصت کیجیے
ورنہ رشوت کی دھڑلّے سے اجازت دیجیے

(۱۶)

بَد بُہت بَدشکل ہَیں، لیکن بَدی ہے نازنیں
جَبڑ کو بوسے دے رَہے ہیں پیڑ سے چیں بر جبیں
آپ گو پانی اُلیچتے ہیں بہ طرزِ دِل نَشیں
ناؤ کا سوراخ لیکن بَند فرماتے نہیں!

کوڑھیوں پر آستیں کَب سی چڑھائے ہیں حُضور
کوڑھ کو لیکن کلیجے سے لگائے ہیں حُضور

(۱۷)

دستکاری کے اُفق پر ابر بن کر چھایئے،
جہل کے ٹھنڈے لہو کو علم سے گرمایئے،
کارخانے کیجئے قایم، مشینیں لایئے،
اُن زمینوں کو جو محوِ خواب ہیں چونکایئے

خواہ کچھ بھی ہو منڈھے یہ بیل چڑھ سکتی نہیں
مُلک میں جب تک کہ پیداوار بڑھ سکتی نہیں

(۱۸)

دِل میں جتنا آئے لوٹیں قوم کو شاہ و وزیر
کھینچ لے خنجر کوئی، جوڑے کوئی چِلّے میں تیر
بے دھڑک پی کر غریبوں کا لہو اکڑیں امیر
دیوتا بن کر رہیں تو یہ غلامانِ حقیر

دوستوں کی گالیاں ہر آن سہنے دیجیے
خانہ زادوں کو یونہیں شیطان رہنے دیجیے

(۱۹)

دامِ اک چھوٹے سے کُوزے کے ہیں سو جامِ بلور
مول لینے جائیں اک قطرہ تو دیں نہر و قصور
اک دِیا جو بیچتا ہے ، مانگتا ہے شمعِ طور
اِک ذرا سے سنگ ریزے کی ہے قیمت کوہِ نور

جب یہ عالم ہے تو ہم رِشوت سے کیا توبہ کریں
توبہ رِشوت کیسی ، ہم چندہ نہ لیں تو کیا کریں

(۲۰)

زُلف اِس کو آپریٹو سِلسِلے کی ہے دراز،
چھیڑتے ہیں ہم کبھی تو وُہ کبھی رِشوت کا ساز
گاہ ہم بنتے ہیں قُمری، گاہ وُہ بنتے ہیں باز
آپ کو معلوم کیا آپس کا یہ راز و نیاز

ناؤ ہم اپنی کِھواتے بھی ہیں اور کِھیتے بھی ہیں
رِشوتوں کے لینے والے رِشوتیں دیتے بھی ہیں

Cooperative

(۲۱)

بادشاہی تخت پر ہے آج ہر شے جلوہ گر
پھر رہے ہیں ٹھوکریں کھاتے زر و لعل و گہر
خاص چیزیں ہیں؟ قیمتیں اُن کی تو ہیں اَفلاک پر
آبخورہ مُنھ پُھلاتا ہے اَٹھنّی دیکھ کر!

چودہ آنے سیر کی آواز سُن کر آج کل
لال ہو جاتا ہے غُصّے سے ٹماٹر آج کل

(۲۲)

نسترن میں ناز باقی ہے، نہ گُل میں رنگ و بو
اب تو ہے صحنِ چمن میں خار و خس کی آبرو
خوردنی چیزوں کے چہروں سے ٹپکتا ہے لہو
روپیے کا رنگ فق ہے، اشرفی ہے زرد رو

حال کے سکّے کو ماضی کا جو سکّہ دیکھ لے،
سو روپے کے نوٹ کے مُنھ پر دوّنی تھوک دے

(۲۳)

وقت سے پہلے ہی آئی ہے قیامت دیکھئے
منہ کو ڈھانپے رو رہی ہے آدمیت دیکھئے
دور جا کر کس لئے تصویرِ عبرت دیکھئے
اپنے قبلہ جوش صاحب ہی کی حالت دیکھئے

اتنی گمبھیری پہ بھی مر مر کے جیتے ہیں جناب
سو جتن کرتے ہیں تو اک گھونٹ پیتے ہیں جناب

کب تک

۱۹۴۹ء

بالآخر جوشؔ صاحبِ قبلہ یہ رنگینیاں کب تک
رہیں گے آپ یوں آوارہ کوئے بُتاں کب تک

کمر میں چاپ ہے خم کی تو بالوں میں دھندلکا ہے
یہ ذکرِ ماہِ نو تا کے، یہ فکرِ کہکشاں کب تک

سماعت سرنگوں ہے، اور بصارت پابہ جولاں ہے،
یہ سازِ مہ وشاں تا کے، یہ نازِ گل رُخاں کب تک

سفینہ غرق ہونے ہی پہ ہے عُمرِ دو روزہ کا
تمناؤں کی یہ موجِ نفس پر کشتیاں کب تک

چراغِ عُمرِ گُل ہونے کو ہے بادِ مُخالف سے
فضائے زِندگانی پر یہ زُلفوں کا دُھواں کب تک
کَفَن کی صُبح طالع ہو رہی ہے بامِ ہستی پر
ارے نادان، یہ ذوقِ حَریر و پَرنیاں کب تک
یہ دَورِ عَقل میں دارئی ذوقِ جُنوں تا کَے،
زَمیں کی پستیوں میں یہ غرُورِ آسماں کب تک
لَبوں پر ثَبت ہونے ہی کو ہے اَب مُہرِ خاموشی
حسینوں کے فَسانے، کم سِنوں کی داستاں کب تک
یہ ذوقِ حُسن صیّادی حَرم اَندر حَرم تا کَے
یہ مَشقِ گُل شکاری بوستاں در بوستاں کب تک!

جھلک کر رہے ہیں نقشِ قدم عمرِ گریزاں کے
نقابِ کیف میں چہرے کی آخر جھرّیاں کب تک

نژادِ نو کو بھی ظالم، جہاں بانی کا موقع دے
ارے پیرانہ سر، یہ دولتِ طبل و نشاں کب تک

دیارِ نجد میں اُترا ہے لشکر نوجوانوں ــــ کا
یہ ضد اے ناقۂ لیلیٰ کے بوڑھے ساربان کب تک

درِ شبنم پہ سر رکھے رہے گی شعلگی ــــ تا کے
اطاعت برف کی کرتی رہیں گی بجلیاں کب تک

حکومت تجھ کو حاصل ہے دیارِ چشم و ابرو کی
مگر اس وسعتِ شل ہیں یہ حکومت کی عناں کب تک

اگر یوں ہی تمہیں شُعاعوں کی رہیں گی باغ پر نظریں،
یہ بوئے یاسمن تا کے، یہ رُوئے گُلستاں کب تک

اِمارت مے کدے کی تجھ کو حاصل ہے مُبارک ہو
رہے گا اِس اِمارت کا مگر نام و نِشاں کب تک

اِدھر شامِ اَودھ ہے اُس طرف صُبحِ بنارس ہے
مگر شامِ اودھ، صُبحِ بنارس کا سماں کب تک

اُفق پر سُرخیاں چھائی ہُوئی ہیں شاہِ خاور کی
شبِ مہتاب کے دھوکے میں یہ انگڑائیاں کب تک

سموم و صرصر و سیلاب کا ہنگام آ پُہنچا
شراب و شعر و شمع و شاہد و شوقِ جواں کب تک

یہ مانا جسم میں تاب و تُواں ہے رُوحِ صہبا سے
مگر یہ جام سے مانگی ہُوئی تاب و تُواں کب تک

چراغِ کُشتہ! یہ رعنائیِ برق و شرر تا کے؟
گدائے مے کدہ! یہ سطوتِ پیرِ مُغاں کب تک

کہے جائے گا تا کے شامِ رنگیں صُبحِ صادق کو
ارے جھٹلائے گا یہ شورِ ناقوس و اذاں کب تک

ہوا میں رقص، شاخوں میں لچک، موجوں میں جُنبش ہے
مُسافر! بسترِ مخمل پہ یہ خوابِ گراں کب تک

جرس ہے نعرہ زن، پچھلا پہر ہے، زرد ہیں تارے
ابھی ہے کوچ میں تاخیر، بابا یہ گُماں کب تک

بڑی بختاوری ہے شاخِ گُل پر آشیاں ہونا،
یہی رُت ہے اگر تو شاخِ گُل پر آشیاں کب تک
بڑی دولت ہے دُنیا کا کسی پر مہرباں ہونا
مگر دُنیا ہے یہ، دُنیا رہے گی مہرباں کب تک
سوا نیزے پہ سورج آ رہا ہے کروٹیں لیتا
یہ سر پر لالہ و نسریں کا آخر سائباں کب تک
فضا کی رُک چلی ہے سانس طوفانوں کی ہیبت سے
یہ جشنِ کشتی و مے خانۂ آبِ رواں کب تک
ہوا میں آہٹیں ہیں آندھیوں کی سنگ باری کی
یہ شمعوں کی چمک، یہ آبگینوں کی دُکاں کب تک

اَجل زَنجیرِ دَر کھڑکا رہی ہے عیش کے بندے،
چٹکتے گُل، اُبلتی مُل، کھنکتی چوڑیاں کب تک
نَصیبِ دُشمناں آفت نہ کوئی جوش آجائے،
مگر، آفت تو آئے گی نَصیبِ دُشمناں کب تک

تین فریادیں

(فریادِ امّاں، فریادِ زباں، فریادِ رِندا)

فریادِ امّاں

(۱)

تشنۂ خوں ہے پھر آئینِ جہاں اے ساقی
پھر صراحی سے انڈیل آبِ مُغاں اے ساقی
ہاں اٹھا جام کہ پھر "فضلِ خداوندی" سے
دہر ہے کارگہِ فتنہ گراں اے ساقی
"للہ الحمد" کہ پھر خونِ محبت کے عوض
آتشِ بغض ہے رگ رگ میں رواں اے ساقی

کھول مے خانہ کہ اِنساں کی "جواں بختی" سے

بند ہے قفلِ درِ اَمن و اَماں اے ساقی

اَپنے مے خانۂ اِخلاص کی جانِب — لِلّٰہ

پھیر دے کعبۂ و کاشی کی عِناں اے ساقی

غَرق کر دے مے گُل رَنگ میں سینوں کا غُبار

ہر نظر ہے تری جانِب نِگراں اے ساقی

فریادِ زباں

(۲)

جس کو اِنسان تو کیا، دیو بہ مُشکِل سمجھیں

زیرِ مشق اب ہے وہ اَندازِ بیاں اے ساقی

جن کو سُنتے ہیں تو کانوں سے ٹپکتا ہے لہو،
اب اُن الفاظ کے خنجر ہیں رواں ای ساقی
کِرکِراہٹ ہے جو فِقروں میں تو آواز میں پھانس
اب وہ لہجوں کا شُبک لوچ کہاں ای ساقی
جِس کے ہر لفظ میں سو پھول مہک اُٹھتے ہیں،
کاٹ دی جائے گی شاید وُہ زباں ای ساقی
ٹِھیکرے بیچنے والوں کے پُرانے گاہک
بند کرتے ہیں جواہر کی دُکاں اے ساقی

فریادِ رنداں

(۳)

ۓ برہمن شور کرے، شیخ دمادم چیخے
اور مستوں پہ ہو شورش کا گماں اے ساقی

تشنہ کاموں کو کرے غرقِ بلا موجِ سراب
اور جگر میں پڑے آبِ رواں اے ساقی

تیر برسائیں دلِ خلق پہ ناقوس و اذاں،
اور کڑکے سرِ قلقل پہ کماں اے ساقی

پنڈت و پیر کریں جنگ و جدل کی تلقین
اور معتوب ہوں رندانِ جہاں اے ساقی

کیا غضب ہے کہ ملیں اہلِ ہوا کو پر و بال
اور گرفتار ہوں اصحابِ مغاں اے ساقی

ۓ بہ سلسلۂ قانونِ ترکِ شراب۔

کیا قیامت ہے کہ ہو کوثر و گنگا میں فساد،

تیغ ہو گردنِ صہبا پہ رواں اے ساقی

ہاں جلا شمع کہ اِس خیمۂ زنگاری میں

پھر ہے گونجا ہوا قرنوں کا دُھواں ای ساقی

دَیر ہے شعلہ فِشاں اور حرم صاعقہ بار

پرتوِ ابر یہاں ہے نہ وہاں اے ساقی!

سانس روکے ہوئے بیٹھا ہے سیہ خانے میں

جوش سا نغمہ زن و زمزمہ خواں ای ساقی!

کچوکا

۱۹۳۸ء

یہ صُبح ، یہ گُلزار ، یہ خُنکی ، یہ ترائی
گردوُں پہ یہ گاتے ہُوئے مُرغانِ ہوا باز
کاخوں پہ یہ دَمکے ہُوئے اَلوانِ سَحَر تاب
شاخوں پہ یہ مَہکے ہُوئے گُل ہائے چَمن ساز
پِگھلی ہُوئی چاندی کی یہ پَستی میں روانی
ڈُھلکے ہُوئے سونے کی بَلندی پہ یہ پَرواز
یہ کُنج میں دو زُہرہ جَبینانِ دِل آویز
جَذبات کی یہ صُبح ، جوانی کا یہ آغاز

شوخی و شرارت سے بہم کھیل رہی ہیں
دونوں ہمہ تن عربدہ، دونوں ہمہ تن ناز
گل ریز و خوش آمیز و سمن بیز و طرب خیز
طرّار و فسوں کار و جنوں بار و سرافراز
بڑھتی ہیں، جھپٹتی ہیں، لپٹتی ہیں دمادم،
آپس کی لگاوٹ ہیں یہ قمری ہے تو وہ باز
کھلتے ہوئے یہ رنگ تو کھلتا ہوا یہ کھیل
وہ حسن کا آئینہ، یہ تفریح کا غمّاز!
یہ داؤں، یہ چھلیں، یہ چھلانگیں، یہ ترارے
یہ پیچ، یہ ٹکراؤ، یہ کشتی، یہ تگ و تاز

باہنیں کبھی گردن میں، تو شانوں پہ کبھی ہات

گُتھنے میں یہ ہیجان، چِمٹنے میں یہ انداز!

پھر سبزۂ خوابیدہ پر اَلعَظمۃُ لِلّٰہ

دونوں کے بھرے جسم کے گِرنے کی یہ آواز

آواز جو اِنسان کی رگ رگ میں اُتر جائے

آواز کہ ہو جس میں درِ جذبِ دُروں باز

آواز میں چھاتی کو جو توڑے وُہ کچھ کَا،

جاں بخش و جگر دوز و جہاں سوز و جُنوں ساز

اللہ ری آواز!

صومعہ و مےخانہ[1]

سنہ ۱۹۴۸ء

اِن اہلِ وقف کو اِتنا وقوف ہوتا کاش،
کہ مے کدے سے کہیں ہے مقام صومعہ پست
شکم پرست کے ظرفِ وضو سے بہتر ہے
نگاہِ اہلِ حقیقت میں جامِ بادہ پرست
اِدھر ہے "آبِ حرام" اور سوئے خُلدِ خرام
اُدھر ہے "نانِ حلال" اور سوئے دوزخ جست
سُبو بدوش خرابا تیوں کے قدموں پر!
جُھکا ہوا ہے سرِ زاہدانِ معدہ پرست

[1] وقفِ حُسین آباد (لکھنوٴ) کی طرف سے ناداروں کے واسطے جو کھانا طیار کیا جاتا ہے اُس کے باب میں ایک پُرانے قومی کارکن نے مجھے اِطلاع دی کہ اُس کا مُعتد بہ حصہ عُمالِ وقف کے تصرف میں "چِھٹنگ" کے نام سے آجاتا ہے۔ جن کے صرف چکھنے میں غذا کی اِتنی بڑی مقدار صَرف ہو جاتی ہے، اگر خدا نخواستہ وہ شکم سیر ہو کر کھا لیں تو قیامت ہی آجائے

دِلوں میں شمرِ لعیں، محفلوں نامِ حُسین!!

چشک کا لُطف زُباں پر، لبوں پہ عہدِ الست

علی علی کی صداؤں سے گرم ہے دنگل!

دکھا رہے ہیں پھبتی یلانِ چابُک دست

بُھلا چکے ہیں رہ و رسمِ ساقیٔ کوثر،

کبھی صُراحیٔ خُمِّ غدیر سے تھے جو مست

بنائے قصرِ دیانت ہلا کے جو رکھ دے،

خُدا گواہ کہ وُہ فتح ہے نقیبِ شکست

ؔ فُقیہ مدرسہ دی مست گشت وفتوٰی داد

کہ مے حرام، ولے بہ زمالِ اوقاف است"

(حافظ)

ؔ قولِ فقیہ مدرسہ کا جزوِ اول غلط ہے اور جزوِ ثانی صحیح۔

چلو چل کے جنگل میں منگل منائیں

(۱)

۱۹۴۹ء

وُہ گھِرتی چلی آرہی ہیں گھٹائیں!

جوانی کی جیسے مسکتی قبائیں

نُکیلے اِشارے، کٹیلی ادائیں

مزا جب ہے دریا کے اُس پار جائیں

حسِینوں کو یہ کہہ کے پٹّی پڑھائیں

چلو چل کے جنگل میں منگل منائیں

کہ جنگل میں منگل منانے کے دِن ہیں [۱]

[۱] یہ مصرع میرے محبوب و مرحوم دوست آزاد انصاری کا ہے۔

(۲)

ملاروں کی موجوں پہ رقصاں ہیں دھارے
بیابان و گلزار جل تھل ہیں سارے
ڈپٹوں کو ڈھلکائے، سینے اُبھارے
حسیں آرہے ہیں کنارے کنارے
انھیں بڑھ کے آؤ گلے سے لگائیں
چلو چل کے جنگل میں منگل منائیں
کہ جنگل میں منگل منانے کے دن ہیں

(۳)

بیابان و قاموس و کوہ و کمر کو
قوانینِ دیرینۂ خیر و شر کو
پُر آشوب و ہمّت شکن بحر و بر کو
اُٹھو، اِس نظامِ قضا و قدر کو
خرابات میں اُنگلیوں پر نچائیں
چلو چل کے جنگل میں منگل منائیں
کہ جنگل میں منگل منانے کے دِن ہیں

(۴)

وہ گردوں پہ برنائیاں گن گنائیں،
کھلیں مستیاں، شوخیاں چہچہائیں
جوانی کی انگڑائیاں رنگ لائیں
وہ آئیں، فضا پر مچلتی وہ آئیں
گملتی، گھمنڈتی، گرجتی گھٹائیں
چلو چل کے جنگل میں منگل منائیں
کہ جنگل میں منگل منانے کے دن ہیں

(۵)

اُٹھو، اِس خَروش و نوا و صدا میں
جوانی و مستی کی عشرت سرا میں
مہکتی ہوا میں، بہکتی فضا میں
اُمنڈتی، مچلتی، برستی گھٹا میں
حسینوں کو باغوں میں جھولے جھلائیں
چلو چل کے جنگل میں منگل منائیں،
کہ جنگل میں منگل منانے کے دِن ہیں

(۶)

یہ گلیوں کی نہریں، یہ کوچوں کے ٹاپو
یہ بھیگے دُپٹے، یہ نم ناک گیسو
یہ موروں کی گونجیں، یہ مٹّی کی خوش بُو
یہ کو کو، یہ رِم جِھم، یہ پی پی، یہ ہو ہو
اُٹھو، ہم بھی ساغر پہ ساغر لُنڈھائیں
چلو چل کے جنگل میں منگل منائیں،
کہ جنگل میں منگل منانے کے دِن ہیں

(۷)

حسیں مُغ بچے وُہ بہ صد ناز آئے
خد و خال میں سُرخ شمعیں جلائے
وُہ بھیگی مسیں، جن میں دِل ڈُوب جائے
جُھکی اَنکھڑیوں میں دُھندلکے چھپائے
اُٹھو اِن دُھندلکوں میں لے لیں بلائیں
چلو چل کے جنگل میں منگل منائیں
کہ جنگل میں منگل منانے کے دن ہیں

(۸)

جو زنجیر تھی پائے رقص و غنا میں،
شکن جس سے تھی ولولوں کی قبا میں
وہ عقل اُڑ رہی تھی جو اپنی ہوا میں
اُسی عقل کو آج کالی گھٹائیں
پہاڑوں پہ لے جا کے ناچا دکھائیں
چلو چل کے جنگل میں منگل منائیں
کہ جنگل میں منگل منانے کے دن ہیں

(۹)

لگائیں تپ ہجر کے مُنھ کو لوکا،
کہ رُت وصل کی ہے، زمانہ خُشبو کا
رُخِ آرزو کو بنائیں بھبو کا
تمنّا کو پہنائیں دھانی شلوکا
سدا رنگ ارمان کو دولھا بنائیں
چلو چل کے جنگل میں منگل منائیں
کہ جنگل میں منگل منانے کے دِن ہیں

(۱۰)

ہوا کا ہے ارشاد ناچو پھوارو

فضا کہہ رہی ہے کہ تھرکو بہارو

گھٹا نعرہ زن ہے، اُٹھو بادہ خوارو

تلاطم کا فرمان ہے، آؤ یارو

پئیں، گائیں، ناچیں، بڑھیں، لڑکھڑائیں

چلو چل کے جنگل میں منگل منائیں

کہ جنگل میں منگل منانے کے دن ہیں

(۱۱)

ترانے ہیں نو خیز، ساقی جواں ہے
جنوں پر فشاں ہے، فسوں نغمہ خواں ہے
زمیں پرنیاں، آسماں گلستاں ہے
گلابی میں شعلے ہیں، سر پر دھواں ہے
اُٹھو، چھائیں، لہرائیں، دھومیں مچائیں
چلو چل کے جنگل میں منگل منائیں،
کہ جنگل میں منگل منانے کے دِن ہیں

(۱۲)

تلاطُم میں ہے قُلزُمِ شادمانی
صُراحی میں آگ اور آنگن میں پانی
جلال و جمال و جُنوں و جوانی
رَم و رَقص و رَنگ و رَباب و روانی
اُٹھو، غُل مچائیں، جئیں، دندنائیں
چلو چل کے جنگل میں منگل منائیں
کہ جنگل میں منگل منانے کے دِن ہیں

(۱۳)

کھلیں آسمانوں پہ گُلزار بن کر
اُڑیں رنگِ بالائے کُہسار بن کر
ہواؤں پہ لہرائیں جھنکار بن کر
فضاؤں پر ابرِ گُہربار بن کر
اُٹھو، ہم بھی گرجیں، بِکھریں، گھڑگھڑائیں کر
چلو چل کے جنگل میں منگل منائیں،
کہ جنگل میں منگل منانے کے دِن ہیں

کُتُب خانہ

(۱)

۱۹۴۸ء

اے کُتُب خانے — مَتاعِ علم کے گنجِ خطیر،
اے کہ تیرا ہر وَرَق اک لکّۂ اَبرِ مُطیر

تجھ میں تابِ مہرِ تاباں، جلوۂ ماہِ مُنیر!
تیری سطریں حاملِ نبضِ حکیمانِ کبیر

بادۂ افشُردۂ افکار تیرے خُم میں ہے
جزر و مدِّ فکرِ انسانی ترے قُلزُم میں ہے

(۲)

تیرے ہر قطرے میں جولانی ہے رودِ نیل کی،
مورتیں ہیں تیرے زرّیں طاق میں تخئیل کی
عظمتیں ہیں تیرے سقف و بام میں تکمیل کی،
تیرے گوشوں میں ہوا ہے دامنِ جبریل کی

تجھ میں ہیں وہ زمزمے آغاز اور انجام کے
اہلِ دل سننے کو آتے ہیں کلیجہ تھام کے

(۳)

تیرے ہر اِک دائرے میں دَولتِ علم و نظر
تیرے ہر مُصحف کی زرّیں جلد میں رُوحِ بشر
ہاں، بہ شکلِ حرف وُہ غُنچے ہیں تُجھ میں جلوہ گر،
کِلکِ جاں پرور نے چٹکا یا تھا جن کو چوُم کر

عِلم کے وُہ ساز جن میں نغمۂ آدوا رہے،
اُن کی تیرے گنُبدِ افکار میں جھنکا رہے

(۴)

اے کہ نقطوں سے ترے شمس و قمر ہیں مُنفعِل،
اے بہارِ پائے دار، اے رنگ و بوئے مُستقِل
تجھ میں ہیں کتنے دماغ اے طاقِ عالی مُشتعِل
کتنے رِندوں کے دھڑکتے ہیں ترے سینے میں دِل

آب و تابِ خوردبین و جلوۂ گُل تجھ میں ہے،
فلسفی کی فِکر، شاعِر کا تخیُّل تجھ میں ہے

(۵)

تیرے گوشوں میں کہیں تو ہے مُنا جاتوں کی گونج،
اور کہیں اربابِ حَلّ وعقد کی باتوں کی گونج،
اور کہیں گُل بانگ میں ڈوبی ہُوئی راتوں کی گونج
اور کہیں اربابِ بینش کی مُلاقاتوں کی گونج

کون کہتا ہے کہ گُل، مُرجھا کے کِھل سکتے نہیں
اُن سے مِلواتا ہے تو، جو لوگ مِل سکتے نہیں

(۵)

تجھ میں نورِ کفر بھی ہے، مشعلِ ایماں بھی ہے،
نعرۂ تجرید بھی ہے، نغمۂ رنداں بھی ہے،
عقل کا سیلاب بھی ہے، عشق کا طوفاں بھی ہے
ریشِ درویشاں بھی تجھ میں، گیسوئے خوباں بھی ہے

تجھ میں ہر اک چیز ہے زیبائش و تزئیں کے ساتھ
تیشۂ فرہاد بھی ہے ابروئے شیریں کے ساتھ

(۷)

تو حقائق کا سفینہ، معرفت کی آب جو،
بادۂ اندیشہ سے چھلکا ہوا تیرا سبو،
جذب ہے حرفوں میں تیرے ای بہشت رنگ و بو،
کتنے ہاتھوں کا پسینہ، کتنی پلکوں کا لہو!!

چاندنی جن سے ابھی تک خاک کے سینے میں ہے
عکس ان اہل نظر کا تیرے آئینے میں ہے

(۸)

تجھ میں ذکر و فکر کے بیتُ الصّنم محفوظ ہیں
آگہی کے دَیر، حکمت کے حَرم محفوظ ہیں
مُطربانِ زِندگی کے زیر و بَم محفوظ ہیں
کاروانِ رفتہ کے نقشِ قدم محفوظ ہیں

جس میں ہر مِلّت کی موسیقی ہے، تو وُہ ساز ہے
تیری خاموشی زباں، تیرا سُکوت آواز ہے

(۹)

اے بباطن بے نہایت، اے بظاہر مختصر،
کاشئ حرف و حکایت، کعبۂ علم و ہنر
اے حریمِ اہلِ دل، اے قبلۂ اہلِ نظر،
اے خموش افسانہ خواں، اے بے زباں پیغامبر

وقت کا ہر گوشہ روشن ہے ترے دربار میں
ہر نفس اک حجِّ اکبر ہے تری سرکار میں

(۱۰)

حَل ہے تیری روشنائی میں بَصیرت کی شُراب
جَھانکتے رہتے ہیں پردوں سے ترے سو ماہ تاب
جھومتا رہتا ہے اَوجِ ذِہن پر تیرا سَحاب
شَیب پر تیرے بَرستا ہے اَدیبوں کا شَباب

اِنتہائے پُختگی کی ضَوفِشانی تجھ میں ہے،
اَہلِ حِکمت کے بُڑھاپے کی جوانی تجھ میں ہے!

(۱۱)

جو بہ صد ندرت مرتب ہے وہ کاشانہ ہے تو
طرفہ قرطاس و قلم کی بزم شاہانہ ہے تو
شمع جس کے گرد پھرتی ہے وہ پروانہ ہے تو
مرمریں اصنامِ ذہنی کا صنم خانہ ہے تو!

ہر کتاب اس ناز و تمکیں سے تری محفل میں ہے
نگ ہے خاتم پر کہ لیلیٰ پردۂ محمل میں ہے

میں حیدری ہوں حیدری

۱۹۴۸ء

(۱)

ہاں میں ہوں میرِ زندگی، دارائے مُلکِ شاعری
غلطیدہ چترِ نخوت[1] دین پر میرا سحابِ کافری
میری حریمِ طبع میں رقصاں بُتانِ آذری
لیکن بہ ایں عزّ و شرف دل ہے رہینِ قنبری
میں حیدری ہوں، حیدری
میں حیدری ہوں، حیدری

[1] میں اِس اضافت کو غلط نہیں سمجھتا۔

(۲)

مُجھ سے دو عالم ضَو فِشاں، مُجھ پر دو عالم مُنجَلی،
ظاہر میں رِندِ بادہ کش، باطن میں درویش وَلی
میری رِدائے فقر میں بوئے حُسینؑ اِبنِ عَلیؑ
گُفتار میں کافرگری، اَفکار میں پیغمبری
میں حَیدری ہوں، حَیدری
میں حیدری ہوں، حیدری

(۳)

پَرتَو ہے اَبرِ قبُلہ کا مجھ رِندِ صہبا نوش پر
زُلفِ عَروُسِ رنگ و بو غلطاں ہے میری دوش پر
قُربان میری دَلق کے، صَدقے مِری پاپوش پر
چینِ قبائے گُل رُخاں، طَرفِ کلاہِ قیصری
میں حَیدَری ہوں، حَیدَری
میں حَیدَری ہوں، حَیدَری

(۴)

کاندھے پہ لہرائے لِواِ انسان کے اِقبال کا
بے خوف و بے بیم و رِجا، بے پیش و پس، بے وَغدغا
جب بامِ گردوں پر گیا میں یا علیؑ کہتا ہُوا،
ذوقِ تواضُع بن گیا، ناز و غُرورِ داوری

میں حیدری ہوں، حیدری
میں حیدری ہوں، حیدری

(۱)
...ں پر کسر بالکل غلط ہے
...ا تو بفتح پڑھا جاتا ہے
رَجا

(۵)

ہاں زِندگی کی "منقبت" میری رَوِش، میرا چلَن
فرشِ مُبیں کی "نعت" سے گوہر فشاں میرا دہن
اِنسانیت کی "حمد" میں ڈوبا ہُوا میرا سُخن
شبّیریت کی مدح ہے اِنسانیت کی برتری
میں حیدری ہوں، حیدری
میں حیدری ہوں، حیدری

(۶)

میں محرمِ نازِ بُتاں ، میں خلوتیٔ مہ رُخاں،
میں واضعِ قانونِ گُل ، میں ناسخِ شرعِ خزاں
میں ناظمِ شہرِ طرب ، میں نائبِ پیرِ مُغاں
میری طریقت ہاؤ ہُو ، میری شریعت کوثری
میں حیدری ہوں ، حیدری
میں حیدری ہوں ، حیدری

(۷)

[1] عالم تھا یہ جنگاہ میں شبیر کی للکار سے
آتی تھی شیروں کی صدا اس گنبدِ دوّار سے
اب تک حسینی وار سے، چلتی ہوئی تلوار سے
تلوار کی جھنکار سے لرزاں ہے چرخِ چنبری،
میں حیدری ہوں، حیدری
میں حیدری ہوں، حیدری

[1] بہ ظاہر اِن دونوں آخری بندوں کو پوری نظم کے موڈ سے کوئی علاقہ معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن بہ باطن کیا علاقہ ہے، اسے میرا ہی دِل جانتا ہے۔

(۸)

اے مہرِ اوجِ کربلا، اے ماہِ چرخِ درد و غم

اے قبلۂ اربابِ حق، اے کعبۂ اہلِ ہمم

اے شاہدِ رنگیں قبا، اے کشتۂ رسمِ ستم

بسیار خوباں دیدہ ام، لیکن تو چیزے دیگری

میں حیدری ہوں، حیدری

میں حیدری ہوں، حیدری

مُشاعروں کو سلام[۱]

۱۹۵۰ء

جو دِل میں بات ہے کُھل کر اُسے بیاں کر دُوں

اگر خفا نہ ہوں بندے سے مُصلحانِ کرام

مُشاعرے نہیں ہوتے ہیں دِین کے پابند

کہ شاعروں کو نہیں فرصتِ دُرُود و سلام

نہ یہ کتھا کی سبھا ہے نہ محفلِ مِیلاد،

یہ آستانۂ رحمٰن ہے نہ منزلِ رام

۱؎ دہلی مرحوم میں، ادب کی بدبختی سے قدامت گزیدگانِ ادب گدازی! ایک "ادب نواز" سبھا پائی جاتی ہے جس کے تمام مسلم ارکان اگر ایک طرف، نام خدا "عالمانِ دینِ متین" و "مفتیانِ شرعِ مبین" قسم کے افراد ہیں تو دوسری طرف اُس کے ہندو ارکان، "منگل دیو جی مہاراج" اور "ککھٹ شاستری" سلسلے کے، اللہ رکھے، چشم و چراغ ہیں۔ — چنانچہ یہ نظم انھیں "کنھیا بولی" اور "میلا دیوں" کے مشاعرے کے واسطے، اُس لمحۂ نامسعود میں دس منٹ کے اندر کہی گئی تھی جب کہ مجھ کو صلاحِ کارِ کج اندیش و من خراب کیا، "تو میرے ایک محبوب دوست نے اپنی محبت و عزت کا واسطہ دلا کر، اس مشاعرۂ غیر شاعرانہ اور اس اجتماعِ ابوالہولان میں شریک ہونے پر، بہ جبرِ کامل، مامور و مجبور کر دیا تھا۔ اور یہی وہ مشاعرہ تھا جس میں ادب نوازی کے مظاہرے کی خاطر ایک دریوزہ گرِ شہرت تنگ بند ہندو اور ایک احسان فراموش اور جاہل مسلمان کانسٹبل کو میرے خلاف زبان کھولنے کی سازش آمیز، مجرمانہ اجازت دینے کی حرکت کا ارتکاب کیا گیا تھا۔

برگردنِ او بماند و برما بگذشت!

مُشاعروں کا نہ بھولے سے اہتمام کریں،
مُناظِروں کے اکھاڑوں کے رُستم و بہرام
رُخِ کلام پہ غازہ مَلیں نہ تقوے کا،
اَدَب کے مُنہ میں لگائیں نہ بندگی کی لگام
ازل سے دِین واَدَب میں بپا ہے جنگِ عظیم،
حلال دِین میں جو شے ہے وہ اَدَب میں حرام
وہاں ثواب کے باہر کہیں جمال نہیں،
یہاں گُناہ میں بھی نورِ وَجہِ ذُوالاِکرام!
وَہاں جو اَمر رَوا ہے وہ ناروا ہے یہاں
وہاں جو چیز کہ تعزیر ہے، یہاں اِنعام

وہاں شکم کا تلاطم، یہاں تخیّل کا

وہاں ہے اکلِ مسلسل، یہاں ہے شربِ مدام

وہاں ہے کوئی مقلّد، تو مقتدی کوئی

یہاں ہے کوئی اگر مقتدا تو کوئی امام

یہاں کنشت میں کھلتا ہے روح کا بازار

وہاں بہشت میں ہوتا ہے حور کا نیلام

یہاں خلوص سے تابندہ خلعتِ رندی

وہاں نفاق سے آلودہ جامۂ احرام

وہاں جو قوم سرافراز ہے، یہاں اسفل

وہاں جو لوگ سلاطین ہیں، یہاں خدّام

یہاں تجلیٔ آبِ بقا، وہاں ظلمات
یہاں حقائقِ ارض و سما، وہاں اوہام
یہاں وجود میں تاباں بداہتی مہ وش
وہاں سجود میں پرّاں کہانتی گل فام
وہاں مصالحِ ذاتی میں گم شیوخِ زماں
یہاں رفاقتِ انساں میں غرق مے آشام
وہاں جو وِردِ مناجات ہے، یہاں ہذیاں
وہاں جو نعرۂ صلوٰۃ ہے، یہاں دشنام
یہاں دماغ فلاطوں ہے اور دِل ہے مسیح
وہاں دماغ کو سرسام ہی تو دِل کو جذام

یہاں بہ ذوقِ صفا، عشرتِ سرود و سرور
وہاں بہ جبرِ ریا، زحمتِ قعود و قیام!
یہاں ہے جسم میں بھی پختہ مغزیِ ارواح
وہاں ہے روح میں بھی خام کاریِ اجسام
وہاں فسردگیِ منظر و فریبِ سراب
یہاں شگفتگیِ جوئے بار و ماہِ تمام!
یہاں ہنوز غزل خواں ہیں انجم و ذرّات
وہاں ہزار برس سے ہے بند راہِ کلام
وہاں جہنّم اُبلتا ہے صبح کی رو میں
یہاں بہشت اُترتی ہے شام کے ہنگام

یہاں ترانۂ رزقِ کریم و آبِ حلال،
وَہاں خزانۂ اموالِ وَقف و نانِ حرام
وَہاں دماغ میں کُھلتی ہیں موت کی راہیں
یہاں نگاہ میں تُلتا ہے زِندگی کا نِظام
وَہاں نماز کے سینے پہ رِیشِ زیبِ رِیا
یہاں نیاز کے شانے پہ گیسوئے اَصنام!
وَہاں دماغ میں تاریکیٔ خس و خاشاک
یہاں نگاہ میں تابِ جواہر و اَجرام
وَہاں زمیں پہ اُترتے ہیں عرش سے آیات
یہاں زمین سے جاتے ہیں عرش پر اَحکام

مُشاعروں میں تقاضائے اِتّقا، کیا خوب!
مُشاعِرہ شبِ آدِینہ ہے، نہ ماہِ صِیام!
غُرورِ مِنبَر و مِحراب اکڑ کے سر نہ اُٹھائے
حُضُورِ خیمۂ رنگینِ حافِظ و خیّام!
دَیارِ کعبہ و کاشی کے گھومنے والے
بِساطِ شِعر و اَدَب پر کریں نہ مَشقِ خِرام
اُدَب، اَدَب ہے، اَدَب کا نہیں کوئی مَذہب
خُدا کے فَضل سے یہ کُفر ہے نہ یہ اِسلام
غُلام اپنا سمجھتے ہیں تاج داروں کو،
جنابِ پیرِ مُغاں کے سُبک تَرین غُلام!

یہاں نسیم کی رفتار میں عنب کا سرور
یہاں شمیم کے آغوش میں طرب کے خیام
یہاں فلک ہے غزل خواں بہ یک ترانۂ کیف
یہاں زمین ہے رقصاں بہ نیم گردشِ جام
سخن کو طول نہ دو جوش مختصر کہہ دو،
اگر یہی ہے روش تو مشاعروں کو سلام

عقیدت کی موت[1]

۱۹۵۰ء

جب کسی کے باب میں ہوتا ہے یہ دل کو یقیں
خواہ مر جائے، بدی یہ شخص کر سکتا نہیں
یہ شرف، جانِ شرف ہے، یہ شریف، ابنِ شریف
یہ ثقاہت کا ہے شیدائی، سفاہت کا حریف
پاک اس کی فکر، اس کا فعل، اس کی گفتگو
یہ تنفّر کا ہے دشمن، یہ تعصّب کا عدو
یہ سراپا صاف باطن، یہ سراسر نیک ہے
ذکر کیا دس بیس کا لاکھوں میں یہ شخص ایک ہے

[1] یہ نظم بھی "مشاعروں کو سلام" سے متعلق ہے، اُس مشاعرے میں میرا ایک "جمعیۃ العلما" قسم کے ہندو لکھنوی دوست نے ایک منافق و جاہل کانسٹبل کو، جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، میرے خلاف سب سے زیادہ اُمنگ کے ساتھ لب کشائی کی اجازت دی تھی۔

یہ وفا کا رازداں، طورِ محبت کا کلیم
اس کے لفظوں میں شمیم، اس کے معانی میں نسیم

مہر پر مامور ہے، اخلاص پر مجبور ہے
یہ صفا ہے، صدق ہے، پاکیزگی ہے، نور ہے

نازشِ اخلاقِ ماضی، نازِ خُلقِ حال ہے
یہ رِشی ہے، یہ مُنی، یہ قُطب ہے، ابدال ہے

حق پسند اس کا تفکر، حسن بیں اس کی نظر
یہ اُخوت کا ہے دیوتا، امن کا پیغامبر

اس کے لہجے میں ہے مُرلی، شام اِس کے ساتھ ہے
اس کے سینے میں ہے بندرابن، یہ گوپی ناتھ ہے

یہ اَہِنسا کا مُبلّغ ہے، یہ گاندھی کا غُلام
با مُسلماں اللہ اللہ، با برہمن رام رام

آبِ زر درکار ہے اِس کے فسانے کے لِئے
یہ نمونہ ہے شرافت کا زمانے کے لِئے

اِس کے باغِ آدمیّت میں ہیں کب سے گرمِ کار
روئے نسریں، جوئے شبنم، بوئے گُل، خوئے بہار

یہ وفا کی شمع ہے، طاقِ صداقت کا چراغ
مرحمت اندیش، کوثر طبع، خوش دِل، تر دماغ

یہ حقیقت میں ہے فرقِ آدمؑ و حوّا کا تاج
دُر جبلّت، لالہ خصلت، برگ سیرت، گُل مزاج

زندگی کا فخر ہے، نوعِ بشر کی آبرو

شیشہ باطن، صبح طینت، نجم فطرت، ماہ خو

اور پھر اک وقت وہ آئے کہ یہ مردِ "حسن"

پردہ اُٹھے، اور برآمد ہو مریدِ اہرمن

تو قسم اُس وقت کی جب روح پر چلتا ہے گھن

صاحبِ عزت پہ جب ہوتا ہے نفرا طعنہ زن

مفسدوں کی شہ پہ اربابِ ادب کے درمیاں،

بے ادب اہلِ نظر پر جب چلاتے ہیں زباں

بے ہنر کرتے ہیں اربابِ ہنر کو جب ذلیل

جب کمینہ کوئی بنتا ہے شرافت کا وکیل

جب کسی جاہل کی داڑھی کو بصد عزّ و وقار
تیرہ دل کہتے ہیں ابرِ رحمتِ پروردگار
تو قسم اُس ساعتِ بد کی جو ہے سب سے بُری
آدمی جب حلقِ محسن پر چلاتا ہے چھُری
تو قسم اُس وقت کی جب باہزاراں شور و شر
جہل تھپّڑ مارتا ہے عِلم کے رُخسار پر
تو قسم اُس وقت کی جب کانپ اُٹھتا ہے بشر
ناخلف، کُتّے کو جب للکارتا ہے باپ پر
کُشتۂ سازِش بروٹس[1] کی شقاوت کی قسم
جولیس سیزر کی خوں آلود حیرت کی قسم

[1] یہ ایک حکیم تھا، جسے جولیس سیزر سے بہت عقیدت تھی لیکن لوگوں نے جب اُس پر سازش کر کے یہ ثابت کر دیا کہ جولیس سیزر کا وجود قوم کے واسطے مضر ہے تو بروٹس نے اُس پر قاتلانہ حملہ کر دیا، اور سیزر نے جب بروٹس کو حملہ آور دیکھا تو حیرت و عبرت کی بنا پر دِفاع سے ہات اُٹھا کر اپنے کو قتل ہو جانے دِیا۔ (ملاحظہ ہو شیکسپیئر کا ڈرامہ جولیس سیزر)

ؔ انیتھنی کی خوں فشاں تقریرِ ماتم کی قسم،
لاشۂ سُہراب پر فریادِ رُستم کی قسم!
بھُول جاتا ہے دِلِ شیطاں بھی جب لاف و گزاف
اُن حوادِث کے مُماثِل ہے یہ خُونی اِنکشاف
یعنی اِنسانوں کے حق میں ننگ ہے اُس کا وجُود
بھیجتا رہتا تھا میں جس پر حِماقت سے دُرُود
صُبحِ نُور افشاں سمجھتا تھا اندھیری رات کو
آبِ حیواں، خیر سے کہتا تھا میں ظُلمات کو
خارِ بد گوہر کو سمجھا تھا چمن پرور گُلاب،
حیف راون کو دِیا تھا رام کا میں نے خِطاب

ؔ جولیس سیزر کا وفادار دوست، جس نے سیزر کے قاتلوں کے سامنے ایک دردناک اور حیرت انگیز تقریرِ ماتم کی تھی۔

زہر کو تریاق، صرصر کو صبا سمجھا تھا میں
ہائے کیا نکلا یہ ظالم، اور کیا سمجھا تھا میں
یہ محل وہ ہے کہ جھک جاتا ہے فرقِ زندگی
لاش اٹھاتا ہے کوئی جس وقت اچھی رائے کی
ذہنِ انساں میں بجھا دیتا ہے نازش کا چراغ
اپنی کم عقلی کا احساس، اپنی کم بینی کا داغ
ڈوب جاتا ہے جگر میں تیر بن کر انفعال
ڈال دیتا ہے سپر یوں نازِ تشخیصِ رجال
یوں لرز اٹھتا ہے اس صدمے سے انساں کا بدن
تاج، فرقِ شاہ سے گر جائے جیسے دفعۃً

ڈوب جاتا ہے یکایک آفتابِ آگہی
دِل پہ چھا جاتا ہے یوں ابرِ غم و شرمندگی
بہ نکلتا ہے لہو، قلبِ عقیدت مند سے
کم نہیں یہ سانحہ مرگِ زن و فرزند سے
خاک پر لاشِ عقیدت، اور بے گور و کفن
الحفیظ و الاماں کربِ شکستِ حسنِ ظن!
کس لئے اِس کرب میں جی سے گذر جاتا نہیں!
مجھ کو حیرت ہے کہ کیوں اِنسان مر جاتا نہیں!!

شُکرِ پروردگار

۱۹۴۹ء

(۱)

یہ ہے دُنیا، گاہ دیپک راگ، گاہے بھیرویں
گاہ نہرِ سلسبیل و گاہ بحرِ آتشیں!

حُسن تو پھر حُسن ہے، گاہے چُناں، گاہے چُنیں
عِشق بھی دُنیا میں اِک انداز پر رہتا نہیں،

شِکوۂ مجنوں نہ کر اے لیلیٰ محمل نشیں
شُکر اے جاں آفریں، الحمد رَبِّ العٰلمیں[1]،

الحمد رَبِّ العٰلمیں

[1] "الحمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العٰلمین" کو مُخفّف کیا گیا ہے، یہ اِس لئے لِکھ دیا گیا کہ قواعد کی رُو سے اِعتراض نہ فرمایا جائے۔

(۲)

رشتۂ دل پارہ پارہ، دامنِ گل تار تار،

دوشِ خار و خس پہ غلطاں، زُلفِ لیلائے بہار

ٹھیکروں کی گردنوں میں لالہ و نسریں کے ہار

لعل و گوہر زیرِ پا، انجم و قمر بالائے دار

ہر لطافت پر زمیں اُلٹے ہوئے ہے آستیں

شکر اے جاں آفریں، الحمدُ ربّ العالمیں

الحمدُ ربّ العالمیں!

(۳)

خوں آشاموں کی خاطر کوثر و شہد و طہور
موجِ نکہت، موجِ نزہت، موجِ نسریں، موجِ نور
نفع خوروں کے بھیانک طاق میں قندیلِ طور
منعمانِ کوردل شایستۂ حور و قصور،
اور معمارانِ عالم درخورِ نانِ جویں،
شکر اے جاں آفریں، الحمد رب العالمیں،
الحمد رب العالمیں

(۴)

اہلِ دولت شادکام، اربابِ جودت سوگوار

خوب رُو مِن جملۂ خُدّام، بدرُو شہریار

تیرگی پہ بارشِ گُل، نور پر گرد و غُبار

بانیانِ امن کی گردن پہ تیغِ آب دار،

حامیانِ جنگ کے شانے پہ زُلفِ عنبریں

شُکر اے جاں آفریں، الحمدُ ربّ العالمیں

الحمدُ ربِّ العالمین

(۵)

مُنعموں کی بستیوں پر رقصِ ابرِ گُل چکاں،
مُفلسوں کی پستیوں میں آتشِ غم کا دُھواں
روئے حق پر زردیِ رنجوریؔ و نقشِ خزاں
چہرۂ باطل پہ تابِ قوس و آبِ کہکشاں
جَور پیشہ، میرِ خرمن، اہلِ تیشہ خوشہ چیں،
شکر اے جاں آفریں، الحمدُ ربِّ العالمیں
الحمدُ ربِّ العالمیں!

(۶)

دوستانِ ابنِ آدم کے لئے دار و رسن،
دشمنانِ آدمیّت کے لئے طرفِ چمن،
نیک خو بیرونِ در، بدخو درونِ انجمن،
کج رووں کو خلعتِ زر، راست بازوں کو کفن
ظلم کو دنیا دیں، انصاف کو دنیا نہ دیں
شکر اے جاں آفریں، الحمد رب العالمیں
الحمد رب العالمیں!

(۷)

نَصب ہیں دو ایک کی خاطر گُلستاں میں خیام،

اور لاکھوں کو چمَن میں بار پانا تک حرام

چَند خاصانِ زماں ہیں؛ اور باقی سَب عوَام

ہَر قدَم پر حاکم و محکوم و خُدّام و اِمام،

اَب بھی ہے اِنساں کا اِنساں اِک غُلامِ کمتریں

شُکر اے جاں آفریں، اَلحمدُ رَبِّ العالمیں!

اَلحمدُ رَبِّ العالمیں!!

(۸)

عقلِ انسانی ہے نا انصافیوں سے اب بھی دنگ،
لعل و گوہر سے فزوں ہے آبروئے خشت و سنگ
آج بھی ظلمت گراں قیمت ہے، ارزاں آب و رنگ
اسپِ تازی اب بھی ہے زیرِ خرِ تیمورِ لنگ
آج بھی خم ہے درِ ذلت پہ انساں کی جبیں،
شکر اے جاں آفریں، الحمد رب العالمیں!
الحمد رب العالمیں!!

(۹)

دہر فریادی ہے اور کوئی نہیں فریاد رس
آرہی ہے موت کی ہر سمت سے بانگِ جرس
دہشتیں ہیں تحت و بالا، دغدغے ہیں پیش و پس
شورِ بے زنجیر ہے، نغمات، پابندِ قفس
زحمتیں ہر سو رواں ہیں، رحمتیں خلوت گزیں
شکر اے جاں آفریں، الحمد رب العالمیں!
الحمد رب العالمیں!!

(۱۰)

دَرد کو، دِل کھول کر، بخشی گئی ہے آب وتاب،
ہَر وَبا کی پَروَرِش ہے، اور بے حَدّ وحِساب
اور بیماروں پہ صَد ہا سختیاں، لاکھوں عذاب
بھوک پر لُطف وکَرَم ہے، اور بھوکوں پر عِتاب
زِندَگی کے دایرے میں موت ہے مَسنَد نشیں،
شُکر اے جاں آفریں، اَلحَمدُ رَبِّ العالَمیں!
اَلحَمدُ رَبِّ العالَمیں!!

(۱۱)

مُفسِدوں کے "رحم" پر ہیں اَمن کے پروردِگار
ہو چکا ہے دامنِ تہذیبِ اِنساں تار تار،
زِندگی بیمار ہے، اور موت ہے "تیماردار"
پھر رہے ہیں ٹھوکریں کھاتے اِمامانِ کِبار
ڈاکوؤں کی جیب میں ہے دولتِ روئے زمیں
شُکر اے جاں آفریں، اَلحمدُ رَبِّ العالَمیں!
اَلحمدُ رَبّ العالمیں!!

(۱۲)

یہ خبر پا کر کہ ہم بھی ڈھونڈتے ہیں سائباں،
یہ کہیں پڑھ کر کہ ہم بھی ہیں گلوں کے قدرداں
دیکھ کر اتنا کہ ہم کو بھی ہے ذوقِ گلستاں،
صرف یہ سُن کر کہ ہم کو بھی ہے فکرِ آشیاں
ہم غریبوں پر امیرانِ چمن ہیں خشمگیں،
شُکر اے جاں آفریں، اَلحمدُ ربِّ العالمیں!

الحمدُ ربِّ العالمیں!!

(۱۳)

علم کو تلخی و ترشی، جہل کو قند و نبات

خوب کو زہرِ ہلاہل، زشت کو آبِ حیات

نار کو روشن سویرا، نور کو تاریک رات

واہ کیا تیور رہیں اے اِنصافِ میرِ کائنات

مرحبا صد مرحبا و آفریں صد آفریں،

شکر اے جاں آفریں، الحمد رب العالمیں!

الحمد رب العالمیں!!

(۱۴۲)

بھوک کے قدموں کے نیچے زندگی ہے پائمال

رِزق کا پیماں خجل، رزاقیت آشفتہ حال،

زہر تک ملتا نہیں کھانے کو پھر اِنتقال،

تیسرے فاقے میں تو خنزیر ہوتا ہے حلال

کہیے کیا اِرشاد ہے اے مُفتیٔ دینِ مبیں؟

شکر اے جاں آفریں، الحمدُ رب العالمیں!

الحمدُ رب العالمیں!!

(۱۵)

"دہر کی تذلیل ہے نوعِ بشر کی دوستی"

"دین کی توہین ہے تبلیغِ حق و راستی"

"مجرمانہ فعل ہے سعیٔ حقوقِ آدمی"

حاکم و عالم میں سازش ہے ہماری قتل کی،

اِس طرف قانونِ محکم، اُس طرف شرعِ مبیں

شکر اے جاں آفریں، الحمد ربِّ العالمین!

الحمد ربِّ العالمین!!

(۱۶)

بَرف کے تودوں میں گُم ہے انجُمن کا سوز و ساز

زِندگی پر طنز و نفرِیں، موت سے راز و نیاز

رو رہی ہے مُنھ چھپائے غیرتِ اربابِ راز

دِیدنی ہیں لیلئ "صُلحِ حُدیبیہ" کے ناز

شرم میں ڈوبا ہوا ہے مُژدۂ "فتحِ مُبیں"

شُکر اے جاں آفریں، الحمدُ رب العالمیں!

الحمدُ رب العالمیں!!

(۱۷)

نامِ جس اللہ کا ہے چشمۂ فیضِ عمیم

باذِل و بخشندہ و منّان و ستّار و کریم

مرکزِ طبعِ سلیم و محورِ "خُلقِ عظیم"

جس کے قدموں پر متاعِ کوثر و باغِ نعیم،

ہم اُسی اللہ کے بندے ہیں اے اربابِ دیں!

شکر اے جاں آفریں، الحمدُ ربِّ العالمیں!

الحمدُ ربِّ العالمیں!!

(۱۸)

عرش پر تختِ جہالت، فرش پر تاجِ ہنر،
سر بلند اربابِ وحشت، سر نگوں اہلِ نظر،
تیرگی رقصندہ و خنداں سرِ دوشِ قمر
دھوپ کی ہل چل حسین ابنِ علی کی لاش پر،
اور رحمت کی گھنیری چھاؤں میں شمرِ لعیں
شکر اے جاں آفریں، الحمد ربِ العالمیں!
الحمد ربِ العالمیں!!

(۱۹)

خیمۂ بوجہل میں روشن چراغِ مُصطفٰے!
قبضۂ مرحب میں تاباں ذوالفقارِ مُرتضٰے،
منبرِ پیغمبری پر ہم ہمہ اِبلیس کا،
موسیٔ عمراں یکے از خادمانِ بے نوا
سامری قُطبِ زماں، فِرعون اَمیرُالمومنیں
شُکر اے جاں آفریں، اَلحمدُ رَبِّ العالمیں!
اَلحمدُ رَبِّ العالمیں!!

بے چارگی

۱۹۵۰ء

خموشی کا سماں ہے اور مَیں ہُوں
دیارِ خُفتگاں ہے اور مَیں ہُوں
کبھی خود کو بھی اِنساں کاش سمجھے
یہ سعیِ رائیگاں ہے اور مَیں ہُوں
شگوفے ہیں نہ گُل سنبُل نہ ریحاں
یہ رنگِ بوستاں ہے اور مَیں ہُوں
گیا وُہ دَور "سِرِّ دلبراں" کا
"حدیثِ دیگراں" ہے اور مَیں ہُوں

کہوں کس سے کہ اِس جمہوریت میں
ہجومِ خر دماں ہے اور میں ہوں
حرم برگشتہ ہے، اور دیر بدظن
خود اپنا آستاں ہے اور میں ہوں
بجائے نغمہ ہائے اہلِ تمکیں،
خروشِ ناکساں ہے اور میں ہوں
بایں ذوقِ وفا کوشیِ پیہم
وفا کا اِمتحاں ہے اور میں ہوں
پڑا ہوں اک طرف دھونی رمائے
عتابِ راہرواں ہے اور میں ہوں

کہاں ہیں ہم زباں اللہ جانے

فقط میری زباں ہے، اور میں ہوں

خموشی ہے زمیں سے آسماں تک

کسی کی داستاں ہے، اور میں ہوں

بہ ایں گل بوئی و رنگیں نوائی

جفائے باغباں ہے اور میں ہوں

قیامت ہے خود اپنے آشیاں میں

تلاشِ آشیاں ہے اور میں ہوں

زمین و آسماں بے رنگ و ویراں

زمین و آسماں ہے اور میں ہوں!

چراغِ کُشتۂ دورِ طرب کا،

ہواؤں پر دُھواں ہے اور میں ہوں

جہاں اک جُرم ہے یادِ بہاراں

وُہ لافانی خزاں ہے، اور میں ہوں

نگاہیں ڈھونڈھتی ہیں مُشتری کو

مری جنسِ گراں ہے، اور میں ہوں

ترستی ہیں خریداروں کو آنکھیں

جواہر کی دُکاں ہے اور میں ہوں

مرا ہندوستاں گُم ہو چکا ہے

نیا ہندوستاں ہے اور میں ہوں

نہیں آتی اَب آوازِ جَرَس بھی
غُبارِ کارواں ہے اور میں ہوں
مآلِ بندگی اے جوشؔ، توبہ،
خُدائے "مہرباں" ہے اور میں ہوں

السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

۱۹۴۸ء

برشہادتِ مہاتما گاندھی

(۱)

اے زمیں کی جیب کے آئینۂ الماس بار
اے فلک کی بزم کے مہرِ درخشانِ بہار
اے وطن کی سر زمیں کے آسمانِ ذی وقار
اے زمانے کی صدف کے گوہرِ انجم شکار
اے صفا کی موج کے لعلِ درخشاں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۲)

اے امیرِ کاروانِ سُخنۃ کارانِ وطن،

اے فقیرِ تاجدارِ تاج دارانِ وطن،

اے اُمید و ہمّتِ ناکام گارانِ وطن،

اے ہلاکِ عشوۂ رنگینِ یارانِ وطن

اے شکارِ کج روانِ وکور مغزاں السّلام

السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۳)

حَیف اے جانِ کرم، نخچیرِ پیکانِ ستم
حَیف اے صیّادِ عنقائے مسرّت، صیدِ غم
حَیف اے دُودِ چراغِ کُشتۂ طاقِ ستم
حَیف اے خاکسترِ پروانۂ بیتُ الصَّنم
اے شہیدِ اتّحادِ نوعِ انساں اَلسّلام
اَلسّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں اَلسّلام

(۱۲)

اے گُلِ افسُردہ بُستانِ حق و راستی
اے سرودِ رفتۂ بزمِ نشاطِ زندگی
اے شبِ مسرُوقۂ زُلفِ درازِ دلبری
اے چراغِ مُردۂ محرابِ امن و آشتی
اے متاعِ بُردۂ گیتا و قُرآں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۱۳)

اَلسَّلام اے آسمانِ صدق کے مہرِ مبیں
اَلسَّلام اے محفلِ اخلاق کے مسند نشیں!
اَلسَّلام اے فرشِ خاک آلود کے عرشِ بریں
اَلسَّلام اے خاتمِ مہر و محبت کے نگیں
اَلسَّلام اے عصرِ حاضر کے سلیماں اَلسَّلام
اَلسَّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں اَلسَّلام

(۱۴۰)

جادۂ حق پہ درخشاں ہیں ترے نقشِ قدم

پر فشاں ہے آسمانِ عدل پر تیرا علَم

اے حسین ابنِ علی کے پیروِ قدسی حشَم!

اے یزیدِ عصرِ نَو کے کُشتۂ ذوقِ ستم

اے صلیبِ تازہ کے عیسیٔ دوراں السّلام

السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۱۵)

تیرے طبلِ جنگ میں بھی سازِ موجِ گنگ تھا
تیرے شیشے کے مقابل، زرد روئے سنگ تھا
خون کی آلودگی سے پاک تیرا رنگ تھا
اسلحہ سے بے خبر تیرا مذاقِ جنگ تھا
السلام اے فاتحِ بے تیغ و پیکاں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

(۱۶)

اے محرّم کے اُفق کی رنگ پروَرِ صبحِ عید
اے محلِّ یاس و نومیدی کی گُل بانگِ اُمید
اے ثنا خوانِ حُسین و دُشمنِ شمر و یزید،
اے رزیلوں کی رزالت کے لئے ضربِ شدید
اے شریفوں کی شرافت کے نگہ باں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۱۷)

اے خطیبِ دوستی، اے دُشمنِ بُغض و عِناد

اے وفا کی آرزو، اے قلبِ رحمت کی مُراد

اے رسولِ عافیت، اے کُشتۂ دیوِ فساد،

بر توحیف اے سعیِ نامشکورِ امن و اِتحاد

اے پریدہ ولولے، پژمردہ ارماں اَلسّلام

اَلسّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں اَلسّلام

(۱۸)

تو ہی اِک دانائے کارِ بزمِ نادانی میں تھا
روشنی کا تو منارہ بحرِ طغیانی میں تھا
تیرے دم سے زمزمہ گنگا کی جولانی میں تھا
نغمہ تجھ سے کوثر و تسنیم کے پانی میں تھا
اے غرورِ ہند و فخرِ مسلماں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۱۹)

اے ہوائے گرم سے پژمردہ باغِ مشکبار
اے جفائے سنگ سے بشکستہ جامِ زرنگار
موت کے مارے ہوئے اے زندگی کے تاجدار
اے خزاں کی دھوپ میں سوئی ہوئی سیجِ بہار
اے اجل کی ظلمتوں کے آبِ حیواں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

(۴)

دہر پر تیری شہادت نے یہ ثابت کر دیا

حد سے بڑھ کر نیک ہونا کس قدر ہے ناروا [۱]

حرفِ حق ہے اہلِ باطل کے لیے طبلِ وغا

سخت ہوتی ہے گناہِ بے گناہی کی سزا

السلام اے کشتۂ خیرِ فراواں السلام

السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

---

[۱] بقول برنارڈ شا۔

(۵)

قاتلوں میں قتلِ انسانی پہ رونا جرم ہے
تخمِ نیکی سرزمینِ دل میں بونا جرم ہے
جذبۂ خدمت سے راتوں کو نہ سونا جرم ہے
مجرموں کے درمیاں معصوم ہونا جرم ہے
اَلسّلام اے پائمالِ ذوقِ عصیاں اَلسّلام
اَلسّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں اَلسّلام!

(۶)

دردِ احساسِ یتیمی سے ہر اک دل ہو اُداس
جادۂ روشن پریشاں، رُوئے منزل ہو اُداس
کون یہ مقتولِ اعظم ہے کہ قاتل ہو اُداس،
صدرِ محفل اُٹھ گیا، محفل کی محفل ہو اُداس
اے ابو الہند، اے خدیوِ کشورِ جاں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۷)

تو انوکھا چارہ فرما، طُرفہ تر دم ساز تھا،
تیری پلکوں کے جھپکنے کا عجب انداز تھا،
ہر جھپک میں خوش دِلی کا سازِ بے آواز تھا
رُوح پر تیری عیاں مِہر و وَفا کا راز تھا
مَسندِ حُسنِ عمَل کے اے غزل خواں اَلسّلام
اَلسّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں اَلسّلام

(۸)

السلام اے سینۂ اقوام کے دردِ نہاں

السلام اے مرہمِ زخمِ دلِ ہندوستاں،

السلام اے دستگیر و چارہ سازِ بیکساں

السلام اے آہِ سردِ تیرہ بختانِ جہاں،

السلام اے اشکِ گرمِ سینہ چاکاں السلام

السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

(۹)

تیرے ہر آغاز میں رعنائی انجام تھی،
تیرے میداں میں سیاست مُرغِ زیرِ دام تھی
تیرے دستِ آگہی میں نبضِ خاص و عام تھی
سطوتِ افرنگ تجھ سے لرزہ بر اندام تھی
اے گدائے خانہ بر اندازِ شاہاں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۱۰)

اے مریضوں کے طبیب، اے خستہ جانوں کے کفیل

اے بہ خلوت موجِ زمزم، اے بہ جلوت رودِ نیل

آتشِ نمرودِ عصرِ نو کے بے پروا خلیل

حرّیت کے درسِ اعظم، حق کے پیغامِ جلیل

آشتی کے حکم، دِل داری کے فرماں السّلام

السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۱۱)

تو امینِ مرحمت، آئینۂ ایثار تھا،
صحتِ افکارِ انساں کے لئے بیمار تھا
برہمن کا چارہ فرما، شیخ کا غمخوار تھا
تو رواداری کا دیوتا، امن کا اوتار تھا
السّلام اے کعبہ و کاشی کے درباں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۳۰)

فقر سے تیرے برستا تھا جلالِ قیصری،
حیف اے لیلائے حرّیت کو قیسِ عامری
ہر تری موجِ نفس تھی اک سرودِ رہبری
تیرے سینے میں دھڑکتا تھا دلِ پیغمبری
اے نوائے انبیائے پاک و امان السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۲۱)

اے مری عشرت ندیدہ رہ برِ عبرت مآل،
اے مرے گردن بُرِیدہ عزم اِتمام وکمال
اے مرے حیواں دریدہ یوسفِ قُدسی جمال
اے مرے صرصر رسیدہ بوستانِ حال و قال
اے مرے خاور گزیدہ شبستاں السّلام
اَلسّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۲۲)

جب سے تو اے بلبلِ شیریں زباں خاموش ہے

مہر بر لب گلستاں ہے، باغباں خاموش ہے

بوئے گل آزردہ ہے، جوئے رواں خاموش ہے

گلشنِ دیرینۂ ہندوستاں خاموش ہے

السلام اے ساکنِ شہرِ خموشاں السلام

السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

(۲۳)

اہلِ کیف و صاحبانِ ہوش کے آرامِ جاں
جملہ مردانِ اُخوّت کوش کے آرامِ جاں
ہر دلِ پُرشورش و خاموش کے آرامِ جاں
قبلۂ رندانِ عالم جوش کے آرامِ جاں
اے تب و تابِ امامِ بادہ نوشاں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

رباعیات

۱۹۴۴ء تا ۱۹۵۲ء

جوشؔ

(۱)

اے طفل، جہاں شکار رہو گا کب تک
آفاق کا شہریار رہو گا کب تک
تا چند چرائے گا مہ و مہر کو گھانس،
آخر ان پر سوار رہو گا کب تک

(۲)

ظلمات کو حاملِ ضیا کرتا جا،
درہائے خیالات کو وا کرتا جا،
اسلاف کا جو قرض ہے تیرے ذمّے
اخلاف کی خدمت سے ادا کرتا جا

(۳)

یوں جھوم کہ گیتی کو جھما دے اے دِل
یوں ناچ کہ گردوں کو نچا دے اے دل
اِس سے پہلے کہ دفن ہو زیرِ زمیں
بالائے زمیں دھوم مچا دے اے دِل

(۴)

دائم حرکت ہے زِندگی کی دم ساز
لرزاں جو نشیب ہے، تو جنباں ہے فراز
منزِل پہ کمر نہ کھول اے بندۂ راہ
منزِل تو ہے اِک تازہ سفر کا آغاز

(۵)

تقدیر اگر دکھائے ایسا اعجاز،
مِل جائے مجھے گنجِ دو عالم ہمراز
میرے دِل پر ہو صرف اِتنا ہی اثر
اِک بوند کی جوں توے پہ چھن سے آواز

(٦)

"بندے! کیا چاہتا ہے؟ دام و دینار؟"
"یا دولتِ پائندہ؟ زُلف و رُخسار؟"
"معبود! نہیں نہیں، کوئی چیز نہیں"
"اِلا آگاہی رُموز و اَسرار"

(۷)

دُکھ شعر سے بے حِساب پائے میں نے
ہر سانس میں سو عذاب پائے میں نے
اُگلے جب بحرِ دِل نے سو لعل و گہر
تحسین کے کچھ حباب پائے میں نے

(۸)

کس پہلوئے نَے میں درد کا تیر نہیں
کس رقص کے گھنگروؤں میں زنجیر نہیں
ہر موجِ سرود میں ہے سینوں کی خراش
آلاتِ فغاں ہیں یہ مزامیر نہیں!

(۹)

تا عُمر ہر ایک فرد چھاتی کوٹے
انسان کبھی نہ بندِ غم سے چھوٹے
کیا نالہ، ترنُّم کے لیے بھی ہے یہ حُکم
تان اِس کی بھی ٹوٹے تو فغاں پر ٹوٹے

(۱۰)

خنجر ہے زمین، تو آسماں ہے شمشیر،
ہر موجِ حیاتِ گزراں ہے شمشیر
مقتول ہی واماندۂ بیداد نہیں،
قاتل کے گلے پہ بھی رواں ہے شمشیر

(۱۱)

اللہ رے اے عربدۂ لیل و نہار

شاہیں کو ہے راحت، نہ کبوتر کو قرار

مُفلس ہے اِدھر نیشِ تعب سے بدحال

مُنعِم ہے اُدھر نوشِ طرب سے بیمار

(۱۲)

ہر دِل کی گھڑی میں اشکِ پیہم کی ہی چین[1]

ہر موجِ ترنُّم میں ہے فریاد کا بین

"اللہ تعالیٰ سے کہو رحم کرے"

"اَللہ تعالیٰ!! یہ اُسی کی تو ہے دین"

[1] زنجیر Chain

(۱۳)

فَریاد، اے کجَ اَدائیِ عُمرِ دراز
ہَمدرد ہی باقی ہے، نہ کوئی ہمراز
سنسان پڑا ہے خیمۂ بزمِ نشاط،
چھنکار، نہ جھنکار، نہ آہنگ نہ ساز

(۱۴)

فَریاد ہے اے عَربدۂ عالَمِ پیر
اَب وُہ شبِ مستی ہے، نہ وُہ ماہِ مُنیر
ایک آن کو یوُں شباب دمکا، جَیسے
بالائے فضا، شہابِ ثاقب کی لکیر

(۱۵)

گُم ہوگئے احباب، شراروں کی طرح
دم باز حبابوں کے اشاروں کی طرح
پھوٹے، ہنستی ہوئی کرن کے مانند
ٹوٹے، گرتے ہوئے ستاروں کی طرح

(۱۶)

"یاں چھپی دھوپ ہے گُلابی سا یا"
"رہتا ہے سحابِ ابدیّت چھایا"
جوشؔ آؤ کہ منتظر ہے بزمِ ارواح"
"آیا، یارانِ رفتہ آیا، آیا"

(۱۷)

سر گھوم رہا ہے ناؤ کھیتے کھیتے،
اپنے کو فریبِ عیش دیتے دیتے
اُف جہدِ حیات!! تھک گیا ہوں معبود
دم ٹوٹ چکا ہے سانس لیتے لیتے!

(۱۸)

لب تشنگیٔ شوق کا اللہ رے جنوں
شبنم کی تمنا میں کھنگالے جیحوں،
مقدارِ طرب — بہ وزنِ یک قطرۂ آب
اور سعیٔ طرب — بہ قدرِ صد قلزمِ خوں

(۱۹)

غم سے نہ کبھی سکون دِل نے پایا
تا دیر نہ کوئی عیشِ دُنیا بھایا
اِک در سے گیا جو ایک کربِ مزمن
تو دُوسرے در سے دردِ تازہ آیا

(۲۰)

مر مر کے جب اِک بلا سے پیچھا چھوٹا
اِک آفتِ تازہ دم نے آکر لوٹا
ایک آبلۂ نو سے ہوا سینہ دوچار
جیسے ہی پُرانا کوئی چھالا ٹوٹا!

(۲۱)

پھر درد کی تازہ رَو مُبارک اے دِل
پھر مشعلِ غم کی لَو مُبارک اے دِل
تکمیلِ مُرادِ کُہنہ کے دوش بدوش
تخلیقِ مُرادِ نَو مُبارک اے دِل

(۲۲)

آغاز — انجام ہے اور انجام — آغاز
کیا پیچ ہیں اے بلاؤں کی زُلفِ دراز
جشنِ مرضِ رفتہ کا طُغیانِ سرود
دیتا ہے نہ آمدہ مرض کو آواز

(۲۳)

جیسے ہی ہُوا ایک تلاطُم رُوپوش
تو دُوسری مَوجِ غَم بہ صد جوش و خروش
در آئی یہ کہتی ہُوئی میرے دِل میں
بندیِ کا سَلام لیجئے حضرتِ جوشؔ

(۲۴)

ہر دَرد کی یہ عَبدِ زُبوں منزِل ہے
کم بخت تباہ ہو، اِسی قابِل ہے
لَچکا، دُنیا، کماں خوشی سے لَچکا
یہ اور کِسی کا نہیں، میرا دِل ہے

(۲۵)

جھجکو، ٹھٹکو، نہ ایک پل بھی شرماؤ
یہ دِل تو ازل ہی سے تمھارا ہی پڑاؤ
اے جُملہ حوادِث و غُموم و آفات
بندے ہی کا یہ غریب خانہ ہے در آؤ

(۲۶)

ہر سانس کو اک عذاب پایا میں نے
عِشرت کی طلب سے ہات اُٹھایا میں نے
جب سِینہ ہوا خروشِ دِل سے محروم
بوتل کو کلیجے سے لگایا میں نے

(۲۷)

کہتے ہیں کہ دِل رَہینِ مستی نہ رہے،[1]
کم بخت کو جھوٹی بھی تسّلی نہ رہے،
کھاتا ہوں شراب پی کے، عشرت کا فریب
یاروں کی تمنّا ہے کہ یہ بھی نہ رہے

(۲۸)

یہ حکم ہے، چُپ سادھ لو، آنکھیں نہ اٹھاؤ
دو خوب اذاں، دُھوم سے ناقوس بجاؤ
گوبر پہ چنے چاب کے پانی پی لو،
بستر پہ گِرو، ڈکار لو اور مر جاؤ

[1] ترکِ شراب کی پالیسی۔

(۲۹)

یہ راز ہے آپ کی نظر سے مستور
درکار ہے زخمِ دل کو آبِ انگور
ترکِ صہبا پہ اُڑ گئی ہیں سرکار؟
اچھا، جو حکم ہو، سر آنکھوں پہ حضور

(۳۰)

یہ حکم نہ بن جائیں فسانے تو سہی
اِس ڈانٹ سے اُبھریں نہ ترانے تو سہی
میخانوں کو اے جیل بنانے والو
جیلیں نہ بنیں شراب خانے تو سہی

(۳۱)

آنا تو صُراحیاں گرا کر آنا
انگُور کی بیل تک جلا کر آنا
مُجھ رِند کے مُنھ پہ تھوک دینا جس روز
اِنسان سے مے کشی چھُڑا کر آنا

(۳۲)

آتے نہیں جِن کو اور دھندے ساقی،
اوہام کے بُنتے ہیں وہ پھندے ساقی،
جس مے کو چھُڑا سکا نہ اللہ اب تک
اُس مے کو چھُڑا رہے ہیں بندے ساقی

(۳۴۳)

خُم کو توڑیں گے یہ کھلونے ، دیکھو
چہرے جیسے پھٹے بچھونے ، دیکھو
جِس کوہ سے گِر چکے ہیں لنکا والے [1]
اُس کوہ پہ چڑھ رہے ہیں بونے دیکھو

(۳۴۴)

اے ترکِ شراب کے پیمبر قلب وکیل
تو جبرِ حکومت کو سمجھتا ہے "دلیل"
تیری دہشت سے چھوڑ دیگا پینا
انسان کو اِس قدر سمجھتا ہے ذلیل

[1] مثل ہے "لنکا ہیں سب باون گز کے"

(۳۵)

خاشاک سے طبعِ بوستاں کو کیا خوف
طوفانِ زمیں سے آسماں کو کیا خوف
مستی میں پڑے دہشتِ ہستی سے خلل،
آوازِ سگاں سے کارواں کو کیا خوف

(۳۶)

ہستی ہے تعب میں، اور طرب میں پستی
غم، شوق سے کھا، آبِ طرب ناک نہ پی
جس حاکمِ بد اصل کا ہے یہ فرمان
اُس حاکمِ بد اصل کی ایسی تیسی

(۳۷)

مُلّا مجھے دیکھ کر بپھر جاتا ہے
چہرے کا ہر اک نقش اُبھر جاتا ہے
صہبا ہوں تو جینا نہیں چھوڑوں گی اُسے
دیکھوں تو مُوا بچ کے کدھر جاتا ہے

(۳۸)

سادھو، بے اعتبار کر دوں گی تجھے
شرمندہ و بے وقار کر دوں گی تجھے
انگور کی بیٹی ہوں، کوئی اور نہیں
دو دن میں ذلیل و خوار کر دوں گی تجھے

(۳۹)

کُل شہر میں ایک ہی عراقی ہے فقط
سب ہو گئے نیک، ایک ساقی ہے فقط
حضرت نبٹا چکے ہیں گویا سب کچھ
اب ایک شراب خانہ باقی ہے فقط

(۴۰)

اے پچھلے پہر، کیوں ہے یہ ظلمت گھر میں
اِک طرفہ غنودگی ہے بام و در میں
شاید کوئی ناتمام خوابِ سحری
بے طرح اُلجھ کے رہ گیا ہے سر میں

(۴۱)

ساحل، شبنم، نسیم، میدان، طیور،
یہ رنگ، یہ جھٹ پٹا، یہ خنکی، یہ سرور
یہ رقصِ حیات — اور دریا کے اُدھر
ٹوٹی ہوئی قبروں پہ ستاروں کا یہ نور

(۴۲)

تخت و تابوت، اضطراب و تمکیں،
شمس و قمر و نجوم و افلاک و زمیں
خویش و رُفقاء و اقرباء و احباب
یہ کون ہیں، کیا ہیں، مجھے معلوم نہیں

(۴۳)

ہر علم و یقیں ہے اک گماں اے ساقی
ہر آن ہے اک خوابِ گراں اے ساقی
اپنے کو کہیں رکھ کے ہیں بھولا ہوں ضرور
لیکن یہ نہیں یاد کہاں اے ساقی

(۴۴)

یہ موت، یہ زندگی، یہ پیری، یہ شباب
عبرت کی یہ خیمے، یہ تمنا کے حباب
کس کو سمجھاؤں، اور سمجھوں کس سے
تعبیر بھی ایک خواب ہی، خواب تو خواب

(۴۵)

"ڈوبیں، کہ اُبھر جائیں؟" نہ پوچھو ہم سے
"ٹھہریں، کہ گُذر جائیں؟" نہ پوچھو ہم سے
"آلامِ حیات اُٹھائیں، اور زِندہ رہیں؟"
"یا چین سے مر جائیں؟" نہ پوچھو ہم سے

(۴۶)

"کِس نہج سے گردُوں کے پھندے کھولیں؟"
"کِس باٹ سے دہر کے شدائد تولیں؟"
اپنے اللہ سے یہ باتیں پوچھو
کیا ہم کو غرض پڑی ہے ہم کیوں بولیں

(۴۷)

کیوں مجھ سے تقاضے ہو کہ "پھندے کھولو"
"کِس طرح کٹے یہ پاپ، بولو، بولو"
بندے کی طرف شوق سے آنا یارو
مایوس اللہ سے تو پہلے ہو لو!

(۴۸)

یہ تحفۂ عبرت و نحوست کیوں ہے
ہستی کو عدم کی یہ بشارت کیوں ہے
اللہ کہیں مِلے تو اُس سے پوچھوں
آخر انساں پہ یہ عنایت کیوں ہے

(۴۹)

ہر صبح کو ابرِ وہم چھاتا ہے یہاں
آیت تو کوئی بھجن سناتا ہے یہاں
کچھ مندر و مسجد ہی پہ موقوف نہیں
سڑکوں پہ جنون آل الاتا ہے یہاں

(۵۰)

ہر آن کے وسوسے، عیاذاً باللہ
الفاظ کی ناپ تول، لہجوں پہ نگاہ
پیمانِ وفا و سوءِ ظن، کیا کہنا
گویا درِ توبہ کھٹکھٹاتا ہے گناہ

(۵۱)

واقف نہیں اس بھید سے یارانِ کبار
کیا تحتِ شعور میں ہے کرب و آزار
بچّوں کی اُچھل کود، کہ بوڑھوں کا سکوں
یہ سب ہے بلائے زندگانی سے فرار

(۵۲)

ہر شغل میں ڈھونڈتی ہے رُوحِ انساں
دردِ آفاتِ زندگی کا درماں،
عورت، ربط، دُعا، مُناجات، شراب
اللہ رے شدائدِ حیاتِ گزراں

(۵۳)

ہر چند یہ جشن، جشنِ جم ہے ساقی
ہر عیش کا سامان بہم ہے ساقی
لیکن دِل کو یہ ہو رہا ہے محسوس
جیسے کوئی چیز پھر بھی کم ہے ساقی

(۵۴)

بے چارہ جگر کے زخم دھو لیتا ہے
سر، بالشِ غم پہ رکھ کے سو لیتا ہے
جب راگ سُنے تو بھید دِل پر یہ کھلا
دُکھیا اِنسان یوں بھی رو لیتا ہے

(۵۵)

گانے پھرتے ہیں پاؤسیری شاعر
چھوٹی ریوڑی، بڑی گنڈیری شاعر
شاید ایک آدھ تو ہے شاعرِ وہبی
باقی لاکھوں ہیں آنریری شاعر

(۵۶)

زردار کا دِل تپاں نہیں ہے اے دوست
انسان کا قدرداں نہیں ہے اے دوست
کس جی سے وُہ مہرباں ہوگا تُجھ پر،
خود پر جو مہرباں نہیں ہے اے دوست

(۵۷)

واقف بھی ہیں آپ ؟ زندگی ہے گرداب
آنسو کی طرح غریب پیتے ہیں شراب
جو وقت ہے دراصل ترس کھانے کا
اُس وقت بھی اعتراض کرتے ہیں جناب!

(۵۸)

مُلا ہو تو خارِ علم چُننے کیوں ں ہو،
ایمان گُبل بھاڑ میں بُھننے کیوں ہو
کہتے ہیں تُمھیں احمق اگر اہلِ خرد،
تُم اہلِ خرد کی بات سُننے کیوں ہو

(۵۹)

اِکرام ہو بے جاہ کا، توبہ توبہ
اِعزاز ہو گُمراہ کا، توبہ توبہ
جو مَردِ سیہ دُروں نہ ہو دشمنِ عقل
وُہ دوست ہو اللہ کا، توبہ توبہ

(۶۰)

اے دہر کے جُملہ عاقلانِ "گُمراہ"
گُمراہ نہیں مُقرّبانِ درگاہ
تُم جنّتِ بے روح سے کیوں ڈرتے ہو
جنّت تو ہے بہرِ ابلہانِ "ذی جاہ"

(۶۱)

مسجد پہ کہیں قہر نہ گرجے، برسے
طوفان اُبل پڑے نہ بام و در سے
یہ عقل کی کون کر رہا ہے تلقین
کہ دو کہ نکل جائے خدا کے گھر سے

(۶۲)

ہاں عقل سے ہشیار نگہبانِ کبار
کرتے ہیں یہ اعلان ہمارے دیں دار
اُتنا ہی بڑے نرخِ متاعِ ایماں
جتنا بھی ہو دین کا حماقت پہ مدار

(۶۳)

تخلیق اگر کیے ہیں بھونڈے اصنام
بُت ساز نہیں ہے مستحقِ اکرام
دُنیا کے مُرقّع کا ہر اک نقشِ قبیح،
"مانی" کے لیے ہے اک مُسلسل دُشنام

(۶۴)

مکر وُہ مناظر نے لگائے ہیں یہ باغ
انسان کی پیاس نے تراشے ہیں ایاغ
دُنیا میں اگر "زِشت" کا روغن نہ رہے
تو "خوب" کا جل سکے نہ بھولے سے چراغ

(۶۵)

پستی میں ہیں نصب سربلندی کے خیام
انوارِ سحر، ذرّیتِ ظلمتِ شام،
واللہ کہ ہر خیر کی بنیاد ہے شر
اترائیں نہ مصلحین و زہادِ کرام!

(۶۶)

رخسارۂ نیکی پہ صباحت نہ رہے
غم کی نجنتی ہوئی مسرت نہ رہے
ہر "خادمِ خلق" نِل مِلا جائے اگر
انسان کو خدمت کی ضرورت نہ رہے

(۶۷)

ہر "خیر" ہے اپنی ہی بھلائی کے لیے،
ہر داد و دہش ہے خود نمائی کے لیے
یاروں نے گرہ کو تو نہ جڑ سے کاٹا،
ناخن رکھے گرہ کشائی کے لیے

(۶۸)

یہ رونقِ بازار نہ گھٹنے پائے،
"نیکی" کا یہ بیوپار نہ گھٹنے پائے
یہ نیک منش چارہ گرانِ انساں،
کوشاں ہیں کہ آزار نہ گھٹنے پائے

(۶۹)

اُمّید کے جس قدر ہیں رِشتے کٹ جائیں
گردِ بے چارگی سے چہرے اَٹ جائیں
باقی نہ رہیں اگر جہاں میں اَمراض
"ہمدرد طبیبوں" کے کلیجے پھٹ جائیں

(۷۰)

کیا لَغو ہے یہ بارِشِ دینار و دِرَم
کیا پوچ ہے اربابِ سخا کا یہ کرَم
مُفلِس نہ رہیں تو زِندہ ہو کر رہ جائے
خیرات و زکوٰۃ و صدقہ و جُود و کرم

(۷۱)

کُلفت سے جو ہوتی ہے وُہ ہجت نہ رہے
دیتا ہے جو افلاس وُہ دَولت نہ رہے
مَر جائیں گلے کاٹ کے "رُحمت والے"
دُنیا کو اگر رَحم کی حاجت نہ رہے

(۷۲)

مَرغوب نہیں یہ نوحہ خوانی مجکو،
جوشؔ، آگ ہے آنسوؤں کا پانی مجکو
مِلتا ہے جب انسان کا "ہمدرد" کوئی
ہوتی ہے شدید بدگمانی مجکو!

(۷۳)

ہر غنچۂ باغِ رحم کُھلا جائے،
اربابِ کرم پہ ابرِ ماتم چھا جائے
باقی نہ رہیں اگر یہ رونے والے
اپنی حالت پر اُن کو رونا آجائے

(۷۴)

ساحل دیتی ہے اِن کو موجِ گرداب
فریاد سے لیتے ہیں یہ کارِ مضراب
"ہمدرد" حرام خوار ہوتے ہیں بہت
اشکوں کو سڑا کے کھینچتے ہیں یہ شراب

(۷۵)

کیا قہر ہے خدمت سے فراغت ہو جائے
معدوم علاج کی مسرت ہو جائے
افسوس کے قابل ہیں یہ دونوں شکلیں
موت آئے کہ بیمار کو صحت ہو جائے

(۷۶)

پائندہ رہو آہ و بکا کے دھندو
کھلنے پاؤ نہ اے گلوں کے پھندو
مٹ جائے کہیں نہ لطفِ "نیکی بازاں"
بدحال و زبوں رہو خدا کے بندو

(۷۷)

جب بھی پڑتا ہے عقلِ انساں میں فتور
جب بھی ہوتا ہے کوئی بندے سے قصور
اللہ سے کہتی ہے مشیّت باَدب
اِس ضرب کو بھی قبول فرمائیں حضور

(۷۸)

دردا کہ علی الرّغم زبور و قرآں
با وصفِ مساعئ رسولانِ زماں
اَب بھی بشریّت ہے نِری شَریّت
اچھا تو ہے مزاج، اللہ میاں؟

(۷۹)

مجھکو ہر پیچ و خم ہے ساقی معلوم
فانی معلوم اور باقی معلوم
ہر لوح پہ ہے علّت و معلول کا نقش
امکانِ امورِ اتّفاقی معلوم

(۸۰)

شاطِر[1] اور کھائے مات، سُبحان اللہ
دِن پر غالب ہو رات، سُبحان اللہ
کیا آپ نے ارشاد کیا "ناخنِ عقل"؟
اور عُقدۂ کائنات، سُبحان اللہ

[1] دشمنانِ عقل پر طنز ہے جو وجدان سے عُقدۂ عالم کھولنا چاہتے ہیں۔

(۸۱)

یہ بزمِ نشاط و محفلِ جم نہ رہے

یہ طرفِ کلاہ و زلفِ پُر خم نہ رہے

"غم خوار" لہو تھوک کے مر جائیں، اگر

دنیا میں، خدا نہ خواستہ، غم نہ رہے

(۸۲)

دل کو یم کرب میں ڈبوتے کیوں ہیں،

شور و شیون میں خود کو کھوتے کیوں ہیں،

بچے صاحب سے کاش پوچھے کوئی

پیدا ہوتے ہی آپ روتے کیوں ہیں؟

(۸۳)

پُرہول ہے دہر کا تلاطُم ساقی،
ہاں بربط و بادہ و ترنُّم ساقی،
اِک بوند کا دس کروڑواں جُزوِ حقیر،
دراصل ہے صد ہزار قُلزُم ساقی

(۸۴)

دِل کا ارمان گا رہا ہے دِل میں،
گھونگٹ کا سِرا اُٹھا رہا ہے دِل میں
ہر پور میں بج رہے ہیں لاکھوں گھنگرو،
یوں بھاؤ کوئی بتا رہا ہے دِل میں!

(۸۷)

وہ آئیں تو ہو گی تمنّاؤں کی عید

مے زُہرہ بنی تو روحِ مستی، ناہید

ارمان بڑھے گلے میں ڈھولک ڈالے

تِھرکی، کوٗلے پہ ہات رکھ کر اُمّید

(۸۸)

صد حیف شراب پی رہا ہوں تنہا

غلطاں بہ سبو، تمام خونِ فن ہا

ٹھہری ہوئی ساغر میں نظر آتی ہے

صہبا، رضی اللہ تعالیٰ عنہا

(۸۵)

دھوئیں ایسی مچی ہوئی ہیں تن میں،
پر کھول رہا ہے مور جیسے بن میں
مجرے میں بدن کے ہو رہے ہیں مجرے
یہ ناچ رہا ہے کون میرے من میں!

(۸۶)

ہر نس میں پری تھرک رہی ہے ساجن
من کی دیوی چہک رہی ہے ساجن
رگ رگ میں ہے "سارے گاما پادھا نیسا"
جیون کی کمر لچک رہی ہے ساجن

(۸۹)

ابنِ آدم کو صاحبِ جاہ کرو،
کم بخت کو اب اور نہ گُم راہ کرو
"اللہ" سے انسان ہے کب کا واقف
انسان سے انسان کو آگاہ کرو

(۹۰)

تعزیر بھی ہم رشتۂ آہ و فریاد
انعام بھی وابستۂ ذوقِ بیداد
سُنتے ہیں کہ ہے یہ روزگارِ سفّاک
اک صاحبِ رحمت و کرم کی ایجاد

(۹۱)

دیکھے ہر سانس میں ہزاروں پھندے
آلام کے کاروبار، غم کے دھندے
"اللہ" نے جب حیاتِ دُنیا بخشی،
مُنھ کھول کے رہ گئے بچارے بندے

(۹۲)

فنِّ اِنساں کُشی سِکھایا ہے اِسے
ذوقِ حق کا لہُو پِلایا ہے اِسے
قاتل سہی، دُنیا کی مذمّت نہ کرو
"اللہ" تعالےٰ نے بنایا ہے اِسے

(۹۳)

روحِ مستی کا جوش مُل میں جیسے
بے تابیٔ جُزو، قلبِ کُل میں جیسے
یوں سوئے شباب جا رہی ہے طفلی
بو کی ہل چل قبائے گُل میں جیسے

(۹۴)

ہر بات میں اک موت کا اُلجھا ہوا راگ
ہر موجِ نفس میں قُلزمِ زہر کا جھاگ
یہ باغِ خلیل و زنِ بدخو میں ہے فرق
وُہ آگ تھی پھول اور یہ پھول ہے آگ

(۹۵)

انفاس میں کافور کی بو رکھتا ہے
رگ رگ جلا ہوا لہو رکھتا ہے
دوزخ اک ناچ گھر ہے اُس کے نزدیک
گھر میں جو زنِ ستیزہ خو رکھتا ہے

(۹۶)

ہر ذرّہ ظلمات ہے عقدِ پروین
ہر سینۂ گرداب ہے دیرِ تمکیں!
تو جس کو سمجھ رہا ہے نفرت اے دوست
وہ پُشتِ محبت کے سوا کچھ بھی نہیں!

(۹۷)

ہر عشق میں اک شانِ عداوت دیکھی
ہر قہر کے طوفان میں رحمت دیکھی
جوڑے کو جو دیکھا نظر آئی نفرت
ٹکڑے کو جو دیکھا تو محبت دیکھی

(۹۸)

ہستی کے شدائد سے نہ کیوں ہو غمگیں
تکرارِ تزلزل ہے بنائے تمکیں
ہر شورِ مسلسل و خروشِ پیہم
خاموشی مستقل ہے اے قلبِ حزیں

(۹۹)

اَب مُطرِبِ وَقت کا تَرانہ ہے کُچھ اَور
بَدلی ہُوئی دُنیا کا فَسانہ ہے کُچھ اَور
ہاں نازُکیٔ طَبع کی روکے ہوئی باگ
شَبّیر حَسَن خاں ، یہ زَمانہ ہے کُچھ اَور

(۱۰۰)

بُجھنے پہ ہے اَب حَیات، جاگو یارو
سُن لو ایک آدھ بات، جاگو یارو
طَیّار ہے کاروانِ عُمرِ فانی،
اب بِھیگ چُکی ہے رات، جاگو یارو

(۱۰۱)

تا حدِّ نظر دوڑ گیا رنگِ شباب
تارِ رگِ زندگی پہ مچلی مضراب
اُن کے آتے ہی مُسکرائے ارماں
دوکانِ جواہر میں در آیا مہتاب

(۱۰۲)

پیری کی ہوا کوچ کا لائی ہے پیام
سینے سے اُکھڑ رہے ہیں پھولوں کے خیام
غلطاں ہیں مہ و سال کی کرنیں سر پر
اے شمعِ حیات و شبنمِ عمر سلام

(۱۰۳)

وُہ دوست، وُہ دُشمن، وُہ اَقارِب، وُہ نِگار
وُہ شہر، وُہ مَدرِسے، وُہ دریا، وُہ دیار
یوں گونج رہی ہیں دِل میں سَب کی یادیں
بَربَط بجنے کے بعد جیسے جھَنکار

(۱۰۴)

شاعر کے لِئے کوہ سے وادی بہتر
ہستی مَندر سے موت بَستی بہتر
سُن تو لیتے ہیں اَہلِ دُنیا اُس کو،
نغموں سے کہیں نَزع کی ہِچکی بہتر

(۱۰۵)

ٹوٹی قبروں پہ نصب کرتے ہیں نشاں
مُردوں پہ لُٹاتے ہیں متاعِ دل و جاں
اِن موت پرستوں کی نظر میں صد حیف
لَو سے بہتر ہے شمعِ کُشتہ کا دُھواں!

(۱۰۶)

سو بار مری دُھوپ کو سونلایا تھا
خود میرے ہُنر سے مُجھے شرمایا تھا
آیا ہے مِری راکھ پہ وُہ بہرِ سجُود
کل جس نے مری آگ کو ٹُھکرا یا تھا

(۱۰۷)

صِحّت میں خَلَل ہو تو نہ عشوے نہ اَدا
ہو ضُعف تو ہر ناز ہے سیٹھا پھیکا
یہ حُسن وشَباب کُچھ نہیں اے ناداں
رُخسار کی جُھرّی کی کھچاوٹ کے سِوا

(۱۰۸)

اِک شخص پہ کَل ٹوٹ پڑی ایک سِپاہ
ضربات سے مَرگیا بصد نالۂ وآہ
اَللہ کی کُچھ چلی نہ اِنساں کے حُضور
کہتا ہی رہا غریب اَللہ اللہ

(۱۰۹)

مقراض خود اپنے کو کتر جاتی ہے
جم جاتی ہے تو، آگ ٹھٹھر جاتی ہے
جتنا بھی ابھارتی ہے جس چیز کو عقل
اتنی ہی وہ غار میں اتر جاتی ہے

(۱۱۰)

اک غنچہ کھلا نو لاکھ غنچے، نکلے
اک نکتہ کھلا تو لاکھ نکتے نکلے
پیچیدہ معمّے سے برآمد ہوا حل
حل کو کھولا تو سو معمّے نکلے

(۱۱۱)

ہر شمع کو، لَو بڑھ کے، بُجھا جاتی ہے
ہر صُبح کو، خود شعاع کھا جاتی ہے
جِس وَقت اُٹھاتا ہوں نقابِ اَسرار
اِک اور نقاب مُنھ پر آجاتی ہے

(۱۱۲)

جو چیز اِکہری تھی وہ دُہری نِکلی
سُلجھی ہُوئی جو بات تھی اُلجھی نِکلی!
سیپی توڑی تو اُس سے موتی نِکلا،
موتی توڑا تو اُس میں سیپی نِکلی

(۱۱۳)

جو علم ہے کافور ہوا جاتا ہے،
جو شعلہ ہے، بے نور ہوا جاتا ہے
صد حیف کہ اُٹھ رہے ہیں جتنے پردے
راز اور بھی مستور ہوا جاتا ہے

(۱۱۴)

ہر چیز کہ جو زیرِ عمل آتی ہے
منظر پہ بصد مکر و دغل آتی ہے
جب ایک چٹان توڑ چکتا ہے دماغ
تو ایک چٹان اور نکل آتی ہے

(۱۱۵)

دِل درد سے معمور ہُوا جاتا ہے
ہمّت کا سبو چُور ہُوا جاتا ہے
صد حیف کہ بڑھ رہا ہوں جِتنا جِتنا
اُتنا ہی اُفق دُور ہُوا جاتا ہے

(۱۱۶)

غم سے نہ کبھی نجات پائی ہم نے
جو موت ہے وُہ حیات پائی ہم نے
نِکلے جو چراغِ صُبح لے کر پئے سیر
ہر موڑ پر اک رات پائی ہم نے

(۱۱۷)

عُریاں ہے جو شے، وُہ بھی ہے مستور ہنوز
ظُلمت کا نُمائندہ ہے ہر نور ہنوز
اَشیاء کے خواص تک ابھی آئی ہے عقل
اَشیاء کے حقائق ہیں بُہت دور ہنوز

(۱۱۸)

ہر صُبح کی ضو شب کی سہیلی نکلی،
اِک مکرِ خس و خار چنبیلی نکلی!
سو سال میں بُوجھی جو پہیلی کوئی
تو بُوجھ بھی خبر سے پہیلی نکلی!

(۳۱۹)

جو شے کہ ہے دُور سے دُرست و مُحکم
نزدیک سے کم مایہ و زِشت و مُبہم
اَندیشہ و اسرار میں ہے رِشتہ وُہی
جو رِشتہ ہے مابینِ شعاع و شبنم

(۳۲۰)

اَللّٰہ رے صہبائے جہالت کا سُرُور
اَپنے کو سمجھ رہا ہوں اِک پیکرِ نُور
مٹھّی میں ہے صِرف ایک کِرَن کا پَرتَو
آنکھوں میں ہے لیکن یدِ بیضا کا غُرُور

(۱۲۱)

راتوں کو فضا پہ لاکھ جلوے دیکھے
اُڑتے ہُوئے نُقرئی ہیولے دیکھے
اور صُبح جو دَمکی تو ہوا پر غلطاں
اپنے ہی دماغ کے پَرَخچے دیکھے

(۱۲۲)

جلوے ہیں حجابِ دید کس سے کہیے
عاشورہ ہے صُبحِ عید کس سے کہیے
اِک خواب ہے خود اپنی جگہ ہر تعبیر
اِک قُفل ہے خود کلید کس سے کہیے

(۱۲۳)

ہر انجمن اک گور ہوئی جاتی ہے
جو آنکھ ہے وُہ کور ہوئی جاتی ہے
شمعوں پہ جلا رہا ہوں پیہم شمعیں
ظُلمت ہے کہ گھنگور ہوئی جاتی ہے

(۱۲۴)

اللہ رے بحرِ زندگی کے سیلاب
سوتی لہروں میں بھی کروروں گرداب
ہر چیز نگاہِ رازجو کے نزدیک
ظاہر میں ہے کوہِ نور، باطن میں حباب

(۱۲۵)

سَو جہل ہیں ہر قدم پہ حائِل، صد حیف
مِلتی ہی نہیں عِلم کی منزِل، صد حیف
کِس نہج سے عُقدہ ہائے مُشکِل کھولوں
ناخُن ہے خود اِک عُقدۂ مُشکِل، صد حیف

(۱۲۶)

ہر سنگ میں شِیشے کے مکاں مِلتے ہیں
ہر تُخم میں خُفتہ بوستاں مِلتے ہیں
روندے ہوئے ذرّوں کے لبوں پر اے جوشؔ
خورشید کے بوسوں کے نشاں مِلتے ہیں

(۱۳۷)

عُقدوں کو یہاں عُقدہ کُشا کہتے ہیں
کیا چیز ہے، اور لوگ کسے کہتے ہیں
اِنسان کے جذبات کی لونڈی ہے وہ عقل
جِس عقل کو میر و مُقتدا کہتے ہیں

(۱۳۸)

چہرہ بھی سُتنا سُتنا ہے، قامت بھی ہے پست
زُلفیں نہ جُنوں خیز، نہ آنکھیں سرمست
معشوقہ یہ آپ کی ہے؟ توبہ، توبہ،
مُجھ کو نہیں معلوم تھا، خیلے خوب است

(۱۲۹)

"بے نغمہ ہے اے جوشؔ ہمارا دربار
اب عالمِ ارواح میں ٹک آؤ بھی یار"
"یہ کون بُلا رہا ہے"؟ "ہم ہیں ای جوشؔ،
آزاد، شرر، رفیع، شاعر، ابرار"[1]

(۱۳۰)

یہ رات کو سوتے سے جگایا کس نے
مجھ کو یہ خموشی سے پکارا کس نے
ماتھے کو مرے کس کے نفس نے یہ چھوا
شانے پہ مرے ہات یہ رکھا کس نے

[1] حضرت آزاد انصاری - (۲) منشی مرزا شرر لکھنوی - (۳) رفیع احمد خاں - (۴) حضرت آغا شاعر دہلوی
(۵) ابرار حسن خاں اثر ملیح آبادی -

(۱۳۱)

یہ راز تھا کیا؟ قلبِ تپاں! کیا معلوم
یہ سحر تھا، یا وہم و گماں؟ کیا معلوم!
مہتاب سے اِک نگاہ آئی سوئے دِل
اور ڈس کے چلی گئی کہاں؟ کیا معلوم

(۱۳۲)

یہ رات، یہ وِیرانہ، یہ ہُو کا عالم!
یہ ہول، یہ تیرگی، یہ ہیجان، یہ غم!
یہ کِن کے جِگر تپاں ہیں بالائے فضا؟
یہ کِن کے دھڑک رہے ہیں دِل زیرِ قدم؟

(۱۳۳)

ہر شے پہ تصرّفِ ملل ہے اے دِل
ہر چیز پہ صدیوں کا عَمل ہے اے دِل
ان راہ کے روڑوں کو حقارت سے نہ دیکھ
ہر سنگ میں اِک تاج محل ہے اے دِل

(۱۳۴)

کرتی ہے گہر کو اشک باری پیدا
تمکین کو موجِ بے قراری پیدا
سو بار چمن میں جب تڑپتی ہے نسیم
ہوتی ہے کلی پر ایک دھاری پیدا

(۱۳۵)

ہر موجِ خُنک، برقِ تپاں ہے اے دوست
ہر کاہ، دلِ کاہ کشاں ہے اے دوست
دامانِ غُبار میں سرِ دوشِ فضا
تاریخ کا ایک کارواں ہے اے دوست

(۱۳۶)

گونجے جب تخمِ گُل میں گُل بانگِ جرس
ٹوٹیں صد ہا زمیں کے پوشیدہ قفس،
رنگِ شمس و قمر اُڑے جب سو بار
اک غنچہ کھلے، وہ بھی پئے چند نفس!

(۱۳۷)

انساں روئے، بہ صد تلاطم روئے
بے موجِ تبسّم و ترنّم روئے
وہ صرف ہنسے بوزنِ یک قطرۂ آب
جو شخص، بقدرِ ہفت قلزم روئے

(۱۳۸)

ہر موج ڈھلی ہوئی تھی زیر و بم میں
ساحل پہ تلاطم تھا دلِ شبنم میں
سنکی سرِ شاخسار یوں بادِ سحر
دل ڈوب کے رہ گیا ندی کے خم میں

(۱۳۹)

اے حاکمِ بدگہر، یہ انداز، یہ ناز
نرمی، نہ نوازش، نہ نفاست، نہ نیاز
پھیکا، پیلا، پھُسکا، پھریرا چہرہ!!
سیٹھی، سیلی، سپاٹ، سوکھی آواز!!!

(۱۴۰)

طالب نہیں اس کا کہ مُدارات کرو!
اخلاق کے ساتھ تو مُلاقات کرو،
حیواں ہو اگر، جاؤ، چرو دشت میں گھانس
انساں ہو تو انساں کی طرح بات کرو

(۱۴۱)

پُر ہَول ہے منزلِ ہزیمت زدگی،
ہمّت کے لئے موت ہے حسرت زدگی
یہ بھی ہے مگر سخت خطرناک کہ دِل
مسرور رہو تا حدِ مسرّت زدگی!

(۱۴۲)

اِس روح شِکن خواب کو بیداری دے
صِحّت کے لئے مذاقِ بیماری دے
اے عشقِ کُہن، جلی ہوئی شمع کے موم،
شُعلے نہ سہی بس ایک چنگاری دے

(۱۴۳)

جو وقت کی فضا ابھی نہیں ہے گل بار
ذہنوں کی ابھی سطح نہیں ہے ہموار
میری اور میری منزلت کے مابین
خود میری حیات کی کھڑی ہے دیوار

(۱۴۴)

بدلی میں وہ پروائی کے جھونکے سنکے،
طاؤس کی گونج میں وہ طبلے ٹھنکے
چھلکاؤ، گھٹا اٹھی ہے، ساغر چھلکاؤ
کھنکے، رقاصہ کے وہ گھنگرو کھنکے

(۱۴۵)

مُشکل ہے بہت ہی جادۂ عقلِ سلیم
ہر جُنبشِ دِل ہے ایک طوفانِ عظیم
مایوس نہ ہو اُس کی شرافت سے کبھی
کرتا ہے جو اپنی غلطی کو تسلیم

(۱۴۶)

کیوں ہجر میں شور کر رہی ہے برسات
سینے میں ہے وُہ ٹیس کہ ہٹتا نہیں ہات
گردوں پہ تڑپ رہی ہیں بچھڑی گھڑیاں
گیتی پہ سِسک رہے ہیں بیتے لمحات

(۱۴۷)

میدانِ تجارت ہے مقامِ ہستی،
اک شے بھی نہیں مُفت، نہ جو بھر مستی
کل اِس کو مَع سُود ادا کرنا ہے
بوتل سے جو قرض لے رہا ہے مستی

(۱۴۸)

اَنفاس سے بُجھ رہی ہے شمعِ آداب
چیخوں سے فضا میں پڑ رہے ہیں گرداب
صہبا کو نہ کر دے کہیں اللہ حرام
کس نے یہ کمینے کو پلادی ہے شراب؟

(۱۴۹)

اے حضرتِ شیخ، حاملِ ریشِ دراز،
غیبت آلودہ زن مزاج و شر باز!
حجرے میں یہ رندوں کی مذمت کب تک
مردانے میں آکے بولیے بندہ نواز،

(۱۵۰)

اِس گردنِ کوتاہ پہ رِیشِ دراز
جیسے لبِ نہر کوئی اونگھی ہوئی قاز
منبر پہ جو کھولتا ہے منہ قاضیٔ شہر،
آتی ہے معاً ٹلی ٹلی کی آواز

(۱۵۱)

یہ وقت ہے، واعظ کی دعائیں لے لو
ہلتے ہوئے شملے کی ہوائیں لے لو
منبر پہ جو رقص میں ہے مثلِ طاؤس
اس ریشِ دراز کی بلائیں لے لو

(۱۵۲)

افراطِ خوشی کا تم پہ طاری ہے وہ غم
آراستگی پر بھی ہیں زلفیں برہم
دل جلنے بہائے تم پر آنسو، کم ہے
اے قومِ مسرت زدگانِ عالم

(۱۵۳)

رہتا اپنا وقار باقی کب تک
کرتا مفلس کی قدر کوئی کب تک
صرف اپنی نگاہ میں ہوں ذی قدر ہنوز
عالم جو یہی رہا تو یہ بھی کب تک

(۱۵۴)

کھچڑی بالوں پہ تیرہ بادل ہے وہی
بجتی ہوئی ولولوں کی چھاگل ہے وہی
گو سر سے گذر چکے ہیں کتنے مہ و سال
اس خانہ خراب دل کی ہلچل ہے وہی

(۱۵۵)

ناچیں گے فضاؤں پہ دمکنا ہے انہیں
کس کو معلوم کب چھلکنا ہے انہیں
کس کس پہ چمک چکے ہیں یہ نجم و قمر
کس کس پر ابھی اور چمکنا ہے انہیں

(۱۵۶)

دیکھا اکثر عجب تماشا ہم نے
ٹولے اُبھرے، چھوا جو ماشا ہم نے
یک بارگی جست کرکے نکلا طوفان
قطرے کو جب اک ذرا تراشا ہم نے

(۱۵۷)

دِل بے کسئ اَدَب پہ تھرّاتا ہے
مرطوب فضا میں دَم گھُٹا جاتا ہے
فِردوسئ ورّودکی سمجھتا ہوں اُسے
مِصرع بھی مِرا آج جو دُہراتا ہے!

(۱۵۸)

اِک عُمر سے زہر پی رہا ہوں ای دوست
سینے کے شِگاف سی رہا ہوں ای دوست
گویا سرِکوہسار تنہا پودا،
یوں اَپنے وطن میں جی رہا ہوں ای دوست

(۱۵۹)

آگاہی علم و فن نہیں ہے اے جوشؔ
اُصطبل ہے، انجمن نہیں ہے ای جوشؔ
ہوتا ہے وطن ہر اک بشر کا لیکن
میرا کوئی وطن نہیں ہے اے جوشؔ

(۱۶۰)

محرومِ نشاطِ زندگی ہوں اب تک
پامالِ خرِ ی و ابلہی ہوں اب تک
اس درد کا تو گواہ رہنا اے وقت
میں اپنے وطن میں اجنبی ہوں اب تک

(۱۶۱)

باقی نہیں اک شعور رکھنے والا،
صہبائے کہن سال کا چکھنے والا
کیا اپنے معانی کا میں رونا روؤں
الفاظ نہیں کوئی پرکھنے والا!

(۱۶۲)

ہر شے پہ سیہ علَم سے لہراتے ہیں
سائے سے ہر اک چیز پہ تھرّاتے ہیں
کیا جانیئے کیا دیکھ رہی ہیں نظریں
آنسو ہیں کہ اُمڈے ہی چلے آتے ہیں

(۱۶۳)

ہر رِند ہے رُو پوش، پُکاروں کس کو
ہر شمع ہے خاموش، پُکاروں کس کو
کس کو معلوم کیا دِلوں پر بیتی،
سب ہو گئے بے ہوش پُکاروں کس کو

(۱۶۴)

نظّارگیانِ موج و ساحِل ہیں کہاں،
اے محفِلِ نو، رَونقِ محفِل ہیں کہاں
ہر سُو ہے بُجھے ہُوئے دِلوں کا انبار
جو شعلۂ و گِرداب تھے وُہ دِل ہیں کہاں

(۱۶۵)

کچھ دادِ جگر کاویِ دم ساز تو دو

اک رشتۂ بے پا کو اذنِ پرواز تو دو

آتے نہیں سامنے جو یارانِ قدیم

کم بخت کی آواز پر آواز تو دو

(۱۶۶)

اربابِ اشارات کہاں ہو، بولو،

رندانِ خوش اوقات، کہاں ہو، بولو

بچھڑا ہوا اک عمر کے بعد آیا ہوں،

یارانِ خرابات، کہاں ہو، بولو

(۱۶۷)

جَلتی ہُوئی شمعوں کے بُجھانے والے

جِلیتا نہیں چھوڑیں گے زَمانے والے

لاشِ دِہلی پہ لکھنؤ نے یہ کہا

اَب ہَم بھی ہیں کُچھ دیر میں آنے والے

(۱۶۸)

ٹھنڈے جھونکو، مُجھے جَلاتے کیوں ہو

بھُولے ہُوئے زَمزمے سُناتے کیوں ہو

جِس سیج پر اینڈی تھی جوانی اک رات

اُس سیج کی سِلوٹیں دِکھاتے کیوں ہو

(۱۶۹)

نازک ہے بہت پچھلے پہر کا ہنگام
اچھا نہیں تختہ ہائے گُل پر یہ خرام
اُس دل کو نسیمِ صُبح گاہی نہ ٹٹول
جس کے کھنڈروں میں سو رہے ہیں گلفام

(۱۷۰)

اُنجُم میں ادائے کم نگاہی آئی
کھلتے ہوئے پھولوں کو جماہی آئی
دِل میں یادِ طرب کی شاخیں لچکیں
یوں باغ میں بادِ صُبح گاہی آئی

(۱۷۰)

ہر یاد میں آنسوؤں کے فوّارے ہیں
ہر سانس میں کھوئے ہوئے مہ پارے ہیں
کل شب کو جو رُخسار تھے مہکے ہوئے پھول
اب دِل میں وُہ دہکے ہوئے انگارے ہیں

(۱۷۱)

اشکوں میں مجھے تول رہے ہیں تارے
یادوں کی گرہ کھول رہے ہیں تارے
خاموش فضاؤں کا اِشارہ پا کر
سینے میں مِرے بول رہے ہیں تارے

(۱۷۲)

یہ سانحہ کیا ہے، کس کو سمجھائیں ندیم
یعنی وہ دل ہے ضربِ ہستی سے دونیم
جس قطرۂ شبنم سے بھی نازک دل میں
چبھتی ہے شمیم، اور کھٹکتی ہے نسیم

(۱۷۳)

گزرے ہوئے لمحوں کی نظاروں کو نہ چھیڑ
بچھڑی ہوئی راتوں کے شراروں کو نہ چھیڑ
جگ بیت چکا ہے دل میں ڈوبے جن کو
اے موجِ نسیم، اُن ستاروں کو نہ چھیڑ

(۱۷۵)

آئینۂ ماضی کو ہٹا دے معبود،
جاگی ہوئی یادوں کو سُلا دے معبود
وہ سانولی صبحیں، وہ سلونی شامیں
اِس صُبح کے تارے کو بُجھا دے معبود

(۱۷۶)

سینے میں کِھلے ہوئے ہیں باسی مِلے
یادوں کے اُبھر رہے ہیں دِل میں چھالے
اللہ کچھ ایسا ہو کہ جلدی سے کہیں،
خورشید اُبھر کر یہ سِتارے کھالے

(۱٧٧)

اَللہ بہُت سَتا رہے ہیں تارے
یادوں کے دِیئے جلا رہے ہیں تارے
آخِر نِکلے گا کب جنازہ اِن کا،
یہ سر پہ جو ٹمٹما رہے ہیں تارے

(۱٧۸)

تارے، دَردِ دل کو کھٹکھٹانے والے
بِیتے ہُوئے دِن یاد دِلانے والے
ایسے ڈُوبیں کہ پھر نہ اُبھریں معبُود
میری آنکھوں کے ڈبڈبانے والے

(۱۷۹)

تارو یہ بجلی ہے تُم پہ گِرنے والی،
کِرنوں میں یہ شوخیاں ہیں گھِرنے والی
ہاں ہاں گُل ہو چکی ہیں میری شمعیں
جھاڑو، تُم پر بھی تو ہے پھِرنے والی

(۱۸۰)

صَد شُکر وُہ رُک گئے تپش کے دَھارے
چنگاریاں کجلائیں، بجھے انگارے
اُبھرا وُہ آفتاب، پھوٹی وُہ کِرن
بھاگے وُہ دَبا کے ڈنک موذی تارے

(۱۸۱)

تاروں کی لحد پہ فرشِ گُل رنگ بچھاؤ
اِس لمحۂ مسعود کو نوشاہ بناؤ
سلما کا دوپٹہ لاؤ، افشاں چھڑکو
ہستی کو دُلھن بناؤ اور رقص میں آؤ

(۱۸۲)

سمجھے کوئی کیا نازکیٔ بِسمِل کو،
طُوفان سمجھتا ہوں نمِ ساحِل کو
یہ سوچ کے شبنم سے بھی کتراتا ہوں
لگ جائے کہیں ٹھیس نہ میری دِل کو

(۱۸۳)

آنے کی طرح قریب آؤ تو سہی
اِس پور کی مہندی کو دکھاؤ تو سہی
بڑھتی ہو کبھی، کبھی ٹھٹک جاتی ہو
کب تک ڈہکاؤ گی، بتاؤ تو سہی

(۱۸۴)

یوں غرقِ مئے شباب باتیں نہ کرو
چوپٹ نہیں پڑتی ہیں وہ گھاتیں نہ کرو
انفاس کی یہ چبھن، عیاذاً باللہ
اُف اتنے قریب آکے باتیں نہ کرو

(۱۸۵)

صد شکر کہ ہر صبح ہے روشن اب تک
ہر شام ہے مہتاب بدامن اب تک
نغموں سے ہیں دہکے ہوئے جذبات ہنوز
بانہوں سے ہے مہکی ہوئی گردن اب تک

(۱۸۶)

سمجھاؤں تو کس نہج سے یہ معنیٔ ژرف
بوتل ہے اُبلتی ہوئی رِستا ہوا ظرف
طوفانِ تمنّا ہے کہ چڑھتی ہوئی دھوپ
اور عمرِ رواں ہے کہ پگھلتی ہوئی برف

(۱۸۷)

لے اے اہلِ وطن اپنے سُخن سے گرماؤ
کانوں میں ہیں پردیس کی بھاشاؤں کے گھاؤ
چکرائے ہُوئے ذوقِ سماعت کو مرے
طاؤس کی آواز کے جھُولے میں جھُلاؤ

(۱۸۸)

وِیران ہے اے نسِیم، میرا پہلو
سچ بول، کہاں سے آج اُڑ لائی ہے تو؟
رس میں ڈوبی ڈُلائیوں کو چھُو کر،
کورے پِنڈوں کی تازہ کچّی خوشبو،

لے لکھنؤ۔

(۱۸۹)

مرہم جب خیر سے لگایا ہم نے
دِل پر اِک زخمِ تازہ کھایا ہم نے
جو درد میں تبدیل نہ ہو آخرِ کار
ایسا درماں کوئی نہ پایا ہم نے

(۱۹۰)

حقّا کہ ہے اعتِدال دانش کی دلیل
خوشتر نہ کثیر ہے، نہ بہتر ہے قلیل
صندل کو بہت سنبھل کر ناداں
ہو جائے گا ورنہ دردِ سر میں تبدیل

(۱۹۱)

یہ بال سیہ، یہ گال گورے گورے
مکھڑے پہ یہ موجِ بادہ کے ہلکورے
غنچوں میں مچل رہی ہیں کرنیں گویا،
آنکھوں میں ہیں غلطیدہ گلابی ڈورے

(۱۹۲)

کیا تجھ پہ جوانیاں ہیں، چشم بد دور
کرڑیل، سنگین، دندناتی، بھرپور
خود اپنی ہی موجوں میں تھپیڑے کھاتی
اک سانس میں نزدیک ہے، اک سانس میں دور

(۱۹۳)

مستی سے چٹک رہی ہے ہر رگ، ہر پور
رفتار میں مڑتے ہوئے سیلاب کا زور
کیا قہر ہے بدمست جوانی تیری
گُمکارتی، گونجتی، گرجتی، گھنگھور

(۱۹۴)

ہر پور میں، عو د جل رہا ہے گویا
اک چشمۂ گرم اُبل رہا ہے گویا
کافر کے گٹھے، بھرے، دہکتے تن سے
جوبن کا دھواں نکل رہا ہے گویا

(۱۹۵)

جز قُربِ نہیں اَب کوئی چارا، جلد آؤ
ہاں آؤ، ارے آؤ، خُدارا، جلد آؤ
اُف یوں کوئی پھیرتا ہے ہونٹوں پہ زباں
اَب دِل کو نہیں صبر کا یارا جلد آؤ

(۱۹۶)

کل رات کو کیا پتا لگایا مینے
کِس نکتۂ باریک کو پایا مینے!
دھڑکن ترے دِل کی مُجھے محسوس ہوئی
جب تیری ہتھیلی کو دبایا مینے!

(۱۹۷)

یہ جسم بھرا بھرا، یہ مواج شباب
گُل بانگ سے گونجی ہوئی گویا محراب
اُبھرے ہونٹوں پہ جوشِ مستی کی خطوط
مستی کے خطوط میں کروروں گرداب

(۱۹۸)

شبنم سے گُلِ حیات نم ہے اے جوشؔ
ہر موجِ نفس، مائلِ رم ہے اے جوشؔ
کب تک بستر پہ یوں ملے گا آنکھیں
اُٹھ، باندھ کمر، کہ رات کم ہے اے جوشؔ

(۱۹۹)

اے ماہ وشوں کے ناز اُٹھائے ہوئے دِل
اپنے ہی لہو میں اے نہلائے ہوئے دِل
اللہ تجھے صبر کی دولت بخشے
اے زُہرہ جبینوں کے ستائے ہوئے دل

(۲۰۰)

ہر خشتِ خرابات ہے اک حجلۂ ناز
ہر گھونٹ میں غلطیدہ ہے اِک قُلزمِ راز
[1] مابینِ لب و جام ہی کُچھ بُعد نہیں
مابینِ لب و گلو بھی ہے راہِ دراز

[1] انگریزی کا مقولہ ہے کہ "مابین جام و لب، لغزشوں کا ایک سلسلہ ہے یعنی ممکن ہے کہ جام بھر تو لیں، لیکن پی نہ سکیں۔

(۲۰۱)

وُہ جوش کہ تھا جو اِتّفاقی نہ رَہا
اَیّامِ شَباب کا وُہ ساقی نہ رَہا
ہَل چَل کے جو بُلبُلے تھے سب ٹُوٹ گئے
جو خُون میں جَھاگ تھا وُہ باقی نہ رَہا

(۲۰۲)

جَذبے گُونجے صَباحِ زَرکار کے ساتھ
نَغمے سَنکے نَسِیم گُل بار کے ساتھ
سَر سے گُذرے جو چَہچَہاتے طایُر
دِل جاگ اُٹھا، فَضا کی جَھنکار کے ساتھ

(۲۰۳)

پھوٹے جو کرن تو چُپ نہ رہنا اے جوشؔ
انوار کی آب جو میں بہنا اے جوشؔ
خاموش ہوا صبح کو یہ کہہ کے چراغ
سورج سے مرا سلام کہنا اے جوشؔ

(۲۰۴)

یہ صبح کی شوخیاں، عیاذاً باللہ
یہ وقت ہے وہ، نظر جھکانا ہی گناہ!
بجلی کے یہ تار، اُن پہ شعاعوں کا یہ رقص
جس طرح خطِ جام پہ ساقی کی نگاہ

(۲۰۵)

جتنا بھی عمل میں جو ذکی ہوتا ہے،
اُتنا ہی وُہ فکر میں غبی ہوتا ہے
یارانِ جفا کوش کی حالت ہی عجیب
بھرتا ہے یہ ساغر تو تہی ہوتا ہے

۲۰۶

صد شُکر کہ اب حُزن ہی جوئے پایاب
غم کے نہیں پڑتے ہیں لہو میں گرداب
یوں دِل پر اب آتی ہیں گھٹائیں جیسے
طوفان میں طائروں کا پرتوِ سرِ آب

(۲۰۷)

میں بھی ہوں مُرید آپ کا، باور کیجیے
بند اب تو یہ تلقین کا دفتر کیجیے
ہاں ہاں حضرت ہیں محرمِ رازِ دوکون!
باتیں اب اور بندہ پرور کیجیے

(۲۰۸)

بیدار غبی، خفتہ ذکی سے بہتر
ظلمت، ناپختہ روشنی سے بہتر
حقّا کہ دروغِ تام، پیشِ عقلاء
سو مرتبہ نیم راستی سے بہتر

(۲۰۹)

آوارہ کو آسودۂ منزل کر دو
نادان کو داناؤں میں شامل کر دو
در پر آیا ہے وحی لے کر جبریل
خدّام، خود اُس پہ وحی نازل کر دو

(۲۱۰)

افسوس کہ ہر سود، زیاں سے ہے قریں،
کانٹوں سے گھری ہوئی ہے پھولوں کی زمیں
کیا فائدے کی اُمید رکھے وہ شخص
نقصان اُٹھانے کی جسے تاب نہیں

(۲۱۱)

بندے کو اسیرِ سرگرانی نہ کریں
فدوی کو رہینِ شادمانی نہ کریں
شاید نہ اُٹھا سکے دِل آب بارِ کرم
ممکن ہو تو آپ مہربانی نہ کریں

(۲۱۲)

"احساس" سے سوچیں نہ "نظر" سے سوچیں
"گردے" سے، نہ "دِل" سے، نہ "جگر" سے سوچیں
"سینے" میں نہیں فکر و تامّل کا مقام
"سینے" سے نہیں، جناب "سر" سے سوچیں

(۲۱۳)

کیوں مفت میں زندگی کو ہلکان کرو
دُنیا کو فضول کیوں پریشان کرو
خود کو جب تک نہ حق پہ قائم کر لو
بھولے سے بھی جنگ کا نہ اعلان کرو

(۲۱۴)

تم میں اک فرد بھی عراقی نہ رہے
اک امر بھی امرِ اتفاقی نہ رہے
ہاں جنگ کا اعلان کرو صرف اُس وقت
جب صلح کا امکان ہی باقی نہ رہے

(۲۱۵)

اِخلاص ترا کبھی حقیقی نہ ہُوا
اِیمان کا تُجھ پہ کیف طاری نہ ہُوا
کافر جو نہ بَن سکا تو مومن بَنتا
اے نامہ سیاہ تُجھ سے یہ بھی نہ ہُوا

(۲۱۶)

آئے ہیں سیاست و جہاں بانی کے
بیٹھو ہیں گروہ زِشت شیطانی کے
اے قِبلہ رِسال دار میجر صاحب
بکرے ہیں مگر حُضور قُربانی کے

(۲۱۷)

چونکی ہوئی ندی میں یہ اونگھی ہوئی ناؤ
یہ صبح، یہ کُہرا، یہ دُھندلکا، یہ الاؤ
گویا اشکوں میں داغِ دل کی سُرخی
یہ آگ کا پانی میں مچلتا لہراؤ

(۲۱۸)

کیوں جورِ خزاں سے مر رہا ہے اے دِل
دَر پردہ چمن سنور رہا ہے اے دِل
پُر ہول و مُہیب زلزلوں کی تہ سے
کوہِ نمکیں اُبھر رہا ہے اے دِل

(۲۱۹)

طوفانِ حوادث میں نہ ہو گم ای دوست
برپا ہے تو برپا ہو تلاطم ای دوست
آنسو کے اُفق سے ہو رہی ہے طالع
وُہ دیکھ نئی صُبحِ تبسُّم اے دوست

(۲۲۰)

ہاں لچھمن و رام نے وُہ چھلکا ئ ایاغ
وُہ دِل ہُوئے بے قرار، کانپے وُہ دماغ
شُعلوں کو لیئے دوش پہ سنکی وُہ ہوا،
طاقِ راون کے جِھلملائے وُہ چراغ

(۲۲۱)

جو خویش کہ ہر صید ہو جاتا ہے
منجملہ "بکر" و "زید" ہو جاتا ہے
دوریِ مسلسل وہ بلا ہے اے جوش
رشتوں کا لہو سفید ہو جاتا ہے

(۲۲۲)

بدمست جو زیرِ بارِ جام و خُم ہیں
خود اپنے ہی رخشِ کارواں کے سُم ہیں
اُن راہ رؤوں کو کیا پکارے کوئی
جو اپنی ہی آوازِ قدم میں گُم ہیں

(۱۲۳)

دولت ارض و سما کی کھو دیتا ہوں،
دل کو یم اشک میں ڈبو دیتا ہوں،
ملتی ہے سہاگ اپنا بڑھائے ہوئے صبح،
جب دیر سے اٹھتا ہوں تو رو دیتا ہوں

(۱۲۴)

کچھ درد سے کہنا ہی چلا جاتا ہے،
غم راہ کا سہنا ہی چلا جاتا ہے،
ڈوبے کوئی جھوپڑی کہ الٹے کشتی
دریا ہے کہ بہتا ہی چلا جاتا ہے

(۲۲۵)

مُنھ نُور سے رُوح دھو رہی ہے ساقی،
سچّے موتی پرو رہی ہے ساقی
دُکانِ جواہر میں چراغاں جیسے
یوں صبح طلُوع ہو رہی ہے ساقی!

(۲۲۶)

وُہ لوگ اُلجھتے نہیں تکراروں میں
رہتے ہیں سُخن سرا کے غمخواروں میں
تا حشر، ملے گی نہ "سُخن فہموں" کو،
جو بات ہے "غالب کے" طرفداروں میں[1]

[1] "ہم سخن فہم ہیں، غالب کے طرفدار نہیں۔"

(۲۲۷)

یہ وہم کہ ہے جو اِتّفاقی نہ رہے
قائم یہ کائنات ساقی نہ رہے
آنکھوں کو کریں بند تو سب کچھ موجود
آنکھیں کھولیں تو کچھ بھی باقی نہ رہے

(۲۲۸)

اَللہ رے خواہشوں کا اندھا طوفان
حسرت، ہُلّڑ، ہراس، ہلچل، ہیجان
اُمڈے ہوئے جذبات ہیں پیغامِ فنا
جب تک کہ نہ ہوں عقل کی زیرِ فرمان[1]

[1] دانستہ اعلانِ نون کیا گیا ہے

(۲۲۹)

یا حلم کی منزلوں میں گھبراتے ہیں،
یا علم کی وادیوں سے کتراتے ہیں،
کیوں شرم انھیں آتی نہیں اے عقلِ سلیم
جو لوگ کہ "عشق" "عشق" چلاتے ہیں

(۲۳۰)

پھر لطف کی چادریں سر دل پر تن جائیں،
پھر خیر سے یک جان و دو قالب بن جائیں
ہم تم روٹھے رہیں گے آخر کب تک،
کیا عمر کا اعتبار، آؤ من جائیں!

(۲۳۱)

اَب دِل کو نہیں صَبر کا یارا، اُٹھیے
پہچانیے دُنیا کا اِشارا، اُٹھیے،
باقی نہیں اک سانس بھی اَب محفل میں
اے حضرتِ جوشؔ اَب تو خُدارا اُٹھیے

(۲۳۲)

صد حیف کہ بد سے اَب بتر ہونا ہے[1]
اَجداد کے محلوں کو کھنڈر ہونا ہے
یہ قصر ابھی تو صرف وِیران ہیں جوشؔ
کل گِر کے اِنھیں راہِ گزر ہونا ہے

[1] وقتی اور آنی کمزوری میں یہ رباعی نازل ہوئی تھی۔ اِس سے ہرگز یہ منشا نہیں کہ میں قصور وصاحبانِ قصور کا ہم درد ہوں۔

(۳۴۳)

رقصِ کشتی، نہ آب و رنگِ ساحل،
سرگوشیٔ خلوت، نہ خروشِ محفل
صد حیف جو اِک شہرِ طرب تھا اِک روز
اب جوشؔ اُداس اُداس رہتا ہے وہ دل

(۲۲۴)

بیگانۂ وحشی و بدحواسی کے نثار

آلام کی اِس ادا شناسی کے نثار

اب کوئی تسلی نہیں دینے والا

اے دِل، اے دِل تری اداسی کے نثار

(۳۳۵)

ہر موجِ نفس میں ہے نئی طغیانی
دُکھ درد کا اِک سیل ہے عمرِ فانی
طوفانِ تمنّا میں تمنّائے سکوں
چھلنی میں حضور بھر رہے ہیں پانی

(۲۳۶)

ہستی اِک خواب بن چکی ہے مولیٰ
نوحوں کی کتاب بن چکی ہے مولیٰ
کب تک ہوں گا نہ ہیں جہنّم واصل
ہر سانس عذاب بن چکی ہے مولیٰ

(۲۳۷)

عُقبیٰ کی خبر، نہ عمرِ دُنیا معلوم،
تا چند رہیں گے بحر و بر کیا معلوم
ہم خاک ہیں اور خاک ہو جائیں گے کل،
اب تک تو ہُوا ہے صِرف اِتنا معلوم

(۲۳۸)

وَرپر ہیں تجلیات، جاگو یارو[1]
روشن ہیں تخیلات، جاگو یارو
شادی کا ترانہ گاؤ، اُبٹن لاؤ
مانجے بیٹھی ہے رات، جاگو یارو!

[1] رات کے پچھلے پہر میں آثارِ صبح دیکھ کر یہ رُباعی کہی گئی ہے۔

ALLAMA IQBAL LIBRARY
48422
J & K UNIVERSITY LIB
Acc No ...48422....

لالہ تیجا رام منیجر نے مُفید عام پریس واقع نکلسن روڈ، دہلی میں چھاپا اور
لالہ موتی رام منیجر نے مُنشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لمیٹڈ پبلشرز دہلی والہ آباد شائع کیا

ALLAMA
IQBAL LIBRARY
UNIVERSITY OF KASHMIR
HELP TO KEEP THIS BOOK
FRESH AND CLEAN.